«ادھر چند سال سے مسلمانوں میں نفس طریقۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم پر غور کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے، اور ایجوکیشنل [illegible] نے اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے انہیں ان کی رہنمائی شروع کر دی ہے، چنانچہ ترجیتہ الاستقلالیہ، تعلیم و تربیت [illegible] اشاعت اسی کی زندہ دلیلیں ہیں، زیر تنقید کتاب بچوں کی فطرت سے متعلق ہے، یہ دراصل ایک انگریزی رسالہ [illegible] ڈی للارسن کی کتاب "بچوں کی علمی تربیت" کا ترجمہ ہے، جناب حامد حسن صاحب قادری درسی کتابوں کے ترجمہ میں مہارت [illegible] ہیں، اور یہ ترجمہ بھی ان کے معیار کے مطابق ہے،

اتالیق، مرتبہ سید مخدوم عالم صاحب مرحوم ص ۶۸، قیمت ۵ ر پتہ مذکورۂ بالا،

یہ ابتدائی رسالہ مسلمان بچوں میں عام معلومات کے ساتھ مذہبی واقفیت پیدا کرنے کے لئے لکھا گیا تھا، کہ اردو زبان [illegible] ہی ساتھ مذہب سے متعلق بھی کچھ نہ کچھ باتیں معلوم ہوتی رہیں، اخلاق و تربیت حسنہ کے تخیل کے پیدا کرنے کا بھی انہیں [illegible] کیا گیا ہے، چنانچہ انہیں تمام خوبیوں کو مدنظر رکھکر ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے شائع کیا ہے، اور ہمکو امید ہے کہ مسلمان [illegible] فائدہ اٹھائیں گے۔

پتھر سے ہیرا، از جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب، ص ۱۱۲ قیمت پتہ:- منیجر نظام المشائخ، بورہ [illegible] نمبر ۵، دہلی،

یہ ایک اخلاقی و تبلیغی اور تربیتی افسانہ ہے، جو اب سے کچھ عرصہ قبل تک نظام المشائخ میں باقساط شائع ہوتا [illegible] تھا، اور اب جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمائش سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

"ن"

سیر الصحابیات

ازواج مطہرات، بنات طاہراتؓ اور عام صحابیاتؓ کی سوانحمریاں، اور ان کے علمی و اخلاقی کارنامے

ضخامت ۱۸۹ صفحے، قیمت ۱۲

منیجر

جلد بست و سوم ۲۳	ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۷ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۲۹ء	عدد ۵

مضامین

[illegible]ات	سید سلیمان ندوی	۳۲۲-۳۲۵
مولانا ابوالبرکات ٹونکی رحمہ اللہ	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	۳۲۶-۳۳۶
[illegible]ن کے سوانح اور اسکے فلسفہ کی اہمیت	پروفیسر یوسف سلیم مرے کالج سیالکوٹ	۳۳۷-۳۴۴
[illegible]نا رکن الدین عشق عظیم آبادی	مولوی سید حسن رضا صاحب بی ٹی اسکول عظیم آباد	۳۴۵-۳۵۲
[illegible]فۂ انبساط	جناب پنڈت مولوی حبیب الرحمن صاحب سنسکرت لکچرر مسلم یونیورسٹی	۳۵۲-۳۶۰
پھلواری شریف میں علم حدیث،	مولانا شاہ محمد عزالدین صاحب ندوی پھلواروی	۳۶۱-۳۶۵
موجودہ روس کی علمی مساعی و مجالس	"ن"	۳۶۶-۳۶۸
[illegible]سندہ کا تاریخی پہلو	"	۳۶۹-۳۷۰
[illegible]ایک مقدس شہر	"	۳۷۰-۳۷۲
اخبار علمیہ	"	۳۷۳-۳۷۶
جام صہبائی	جناب آثر صہبائی بی۔اے	۳۷۷
جواب آثر	مولوی محمد یوسف صاحب اثر ردولوی	۳۷۸
[illegible]ایران کا تمدن	مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۳۷۹-۳۹۶
مطبوعات جدیدہ	"ن"	۳۹۷-۴۰۰

شذرات

دار المصنفین اپنے آغازِ وجود سے اُس چشمۂ کرم سے فیضیاب ہے، جس کے فیضِ وجود سے ایک عالم [illegible] اعلیحضرت سلطان العلوم شہریار دکن خلد اللہ ملکہ، و دام سلطنتہ کی سرکار نے علم و فن کی قدر دانی، اور قومی انجمنوں [illegible] کی دستگیری، اور امور خیر کی امداد و اعانت میں ہمیشہ جس اولو العزمی اور سیر چشمی کی نظیریں پیش کی ہیں وہ تاریخ [illegible] کہن نہیں، بلکہ روزمرہ کے واقعات ہیں، اور یہ کہنا تمامتر صداقت ہے کہ آج اسی چراغ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ [illegible]

اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ نے دو دفعہ از خود سیرۃ النبیؐ کی تالیف کی قدر دانی میں دو سال کے لیے دو دو روپیہ [illegible] دار المصنفین کو مرحمت فرمائے تھے، ادھر چھ سات برس سے یہ سلسلہ ملتوی تھا، پچھلے سال حیدرآباد کی حاضری کے موقع [illegible] بارگاہِ خسروی میں باریابی کا شرف عطا ہوا، اور تقریباً ۴۵ منٹ تک دار المصنفین، ندوۃ العلما، قومی مدارس، تعلیم [illegible] اردو مصنفین، مولانا حالی، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، سر سید کی تفسیر، مسئلۂ تاویل اور دوسرے دقیق مباحث [illegible] خیال ہوتا رہا، جس میں یہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت یہ کسی سلطان کی بارگاہِ شاہی نہیں، بلکہ کسی نقاد فن محقق [illegible] علم ہے، اس موقع پر میں نے پیشگاہِ معلّی میں دار المصنفین کے سیر الصحابہ کا سلسلہ نذر گذرانا تھا، اور اس مقوی [illegible] کے اجرا کی درخواست پیش کی تھی، اب یہ نویدِ مسرت سنکر ناظرین کو خوشی ہوگی کہ اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ نے اس [illegible] کو شرفِ قبول بخشا اور شوال المکرم ۱۳۴۷ھ سے دو مزید سالوں کے لیے دو سو ماہوار کی اس خاص امداد کے جاری [illegible] لیے فرمانِ مبارک صادر فرمایا،

آہنگ صد ہزار دعا میرسد بگوش تا از نیاز حلقۂ ایں در گرفتہ ایم

دانت زبابیں ہمہ آثارِ فرخی از معجزات دین پیمبر گرفتہ ایم،

اسی سلسلہ میں یہ خوشخبری بھی کچھ کم باعثِ مسرت نہیں کہ حضرت محی الدین عالمگیر فاتح دکن کے رقعات [illegible] کی تالیف و ترتیب کا جو اہم کام دار المصنفین میں انجام پا رہا ہے، اور جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے، اعلیحضرت محی الدین [illegible] دکن خلد اللہ ملکہ نے اس کو اپنے اسم مبارک سے منسوب و معنون کرنا منظور فرمایا ہے، اور ایک خاص فرمان [illegible] کے ذریعہ اس کے لیے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے، یہ بھی شہنشاہ عالمگیر کے خصوصیات و امتیازات متبرکہ [illegible] ایک نئی خصوصیت اور نئے امتیاز کا اضافہ ہے،

نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی (صدر الصدور امور مذہبی دولت بہیۂ آصفیہ) جو نواب عماد الملک [illegible] صدر اول مجلس دار المصنفین کے بعد سے ہماری مجلس کے صدر ہیں، ان کو اس قاعدہ اور ضابطہ کے تعلق کے علاوہ مولنا [illegible] دار المصنفین سے جو گونا گوں تعلقات تھے اور ہیں ان کی بنا پر اب تک شبلی کے اس مدفن اور ان کی زندہ آرزو [illegible] مرکز میں ان کو کئی دفعہ آنا چاہیئے تھا، مگر قلتِ فرصت کے سبب سے ہر سال یہ فرض دوسرے سال پر اٹھ رہا، [illegible] کئی سالوں سے ہنگر یہ کام مہینوں پر آگیا ہے، ممدوح نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس دفعہ برسات کی چھٹیوں میں جو [illegible] محرم الحرام میں یا اس کے بعد پڑے وہ یہاں تشریف لائیں گے،

دار المصنفین میں اسوقت دو نئی کتابیں زیر طبع ہیں جنمیں سے ایک کا نام "اسلامی قانونِ جنگ" ہے، جسمیں [illegible] اسلامی قوانینِ جنگ کا، دوسری قوموں کے قوانینِ جنگ سے مقابلہ کیا گیا ہے اور خصوصیت کیساتھ ممالکِ یورپ کے [illegible] قوانینِ جنگ سے تفصیلی موازنہ کرکے بتایا گیا ہے، کہ اسلام کا قانونِ جنگ کتنا ارفع اور بلند ہے، ساتھ ہی اسلامی [illegible] کی حقیقت اور اس کے شرائط و ضوابط پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے، امید ہے کہ یہ اپنے رنگ کی نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہوگی

دوسری کتاب کا نام "اسلامی قانون فوجداری" ہے، انگریزوں کی ابتداے عہد تسلط میں ہندوستان کی

میں اسلامی قانون جاری تھا جس کے سمجھنے میں انگریز حاکموں کو دقتیں پیش آتی تھیں، اس کے حل کے لیے اس

مختلف علما نے فارسی میں اس قسم کی مختلف کتابیں لکھی تھیں جنہیں سے ایک کا نام اختیار ہے، دارالمصنفین نے جناب

میر احمد شریف صاحب وکیل حیدرآباد دکن کی فرمایش پر اس کتاب کو موجودہ طرز قانون کے مطابق نئی ترتیب دی

عربی مع حوالہ کتب فقہی ہے، دوسرے کالم میں اسکا سلیس اردو ترجمہ ہے' ہر دفعہ پر ترتیب وار نمبر ہے، ہر دفعہ

نمبر کے ساتھ لطور عنوان لکھا ہے، جن اسلامی ریاستوں میں اسلامی قانون فوجداری زیر عمل ہے، وہاں کے لیے تو اس

بیحد ضروری ہونے میں کوئی شبہہ ہی نہیں، مگر عام قانون پیشہ حضرات کی دلچسپی اور قانونی معلومات کے اضافہ کے لیے

مفید ہونا مسلم ہے، ساتھ ہی عام طالبین کو اسلامی قانونِ فوجداری کے سمجھنے، اور زمانۂ حال کے دوسرے قوانین

سے اس کے موازنہ ومقابلہ کرنے میں بڑی آسانی ہوگی،

ناظرین تک اب تک یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی کہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد نے امسال کے علمی مقررین میں

کو بھی منتخب کیا تھا، اڈیٹر معارف کی یہ تقریریں ۲۲-۲۳-۲۹ مارچ سنہ کو الہ آباد یونیورسٹی ہال میں ہوئیں، تقریروں

موضوع "عرب اور ہند کے علمی تجارتی اور مذہبی تعلقات" تھا، یہ سلسلہ پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے جسکی ضخامت

صفحہ کے قریب ہو، اکاڈمی کے زیراہتمام عنقریب یہ تقریریں خوشنما ٹائپ میں کتابی صورت میں شائع ہونگی،

وہ فتنہ جسکو ہندوستان سے بہت دور باسفورس کے سواحل کے پاس بتایا جاتا تھا، اب روز بروز

اٹھتا ہے، اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ڈاکٹر راس صاحب جنکو ہندوستان اچھی طرح جانتا ہو وہ، دو بار انگلستان سے

نیل اور وادی نیل سے ہوکر آب رکنا باد میں عزم سے روانہ ہوے ہیں کہ وحشی عربوں اور ایرانیوں کو

مشورہ دیں کہ وہ عربی خط چھوڑ کر لاطینی رسم الخط اختیار کرلیں، ساتھ ہی ونامتہ ہند لندن نے از راہ غایت شفقت

ہندوستان سے دریافت کیا ہے کہ اگر اردو زبان کے لیے عربی خط کے بجاے لاطینی خط اختیار کیا جاے تو کیا ہرج ہی

تبدیلی خط کے لیے عجیب مضحکہ خیز دلیلیں پیدا کیجاتی ہیں، کبھی ٹائپ کی خوبی، نسخ ونستعلیق کے ٹائپوں کا اچھا نہ ہونا، کبھی ابتدائی تعلیم کی راہ میں اس رسم الخط کی دقتوں کا ذکر ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا آج سے پہلے بھی یہ دقت مسلمانوں کی تعلیم اور کتابوں کی اشاعت میں پیش آئی تھی؟ اصل یہ ہے کہ معلول ہمارے سامنے متعین صورت میں موجود ہے یعنی یورپ کی ترقی، لیکن اسباب وعلل کی تعیین ہمارے خیال میں نہیں اسلیئے ہر چیز جو سامنے آتی ہے، ہم اسی کو اسکا سبب وعلت قرار دیکر اس کی نقالی کرتے ہیں معاشرتی اصلاح کے لیے بے پردگی، مالی اصلاح کے لیے سود، تعلیمی ترقی کے لیے لاطینی خط، یہ تین باتیں ہم نے سمجھی ہیں، حالانکہ ترقی کا ذریعہ صرف ایک ہے، پاک دل مستقل عزم، قوی عمل، مشرق میں جاپان سے بڑھکر کوئی ترقی یافتہ قوم نہیں، مگر اس کا خط آپ نے دیکھا ہے؟ سرتا پا نقش ونگار ہے، اوپر سے نیچے کی سطروں میں ایک ایک حرف لکھنا، اردو کے ایک فقرہ لکھنے کے برابر ہے، لیکن خط کی یہ دقت اس کی ترقی واشاعتِ تعلیم میں حارج نہیں، البانی قوم نے سنہ ہی سے اپنا خط لاطینی بنالیا ہے، مگر آج وہ مشرق کی بھی بہت سی قوموں سے زیادہ جاہل ہے، یہ لاطینی خط ان کے شوقِ تعلیم میں ایک ذرہ بھی اضافہ نہ کرسکا،

مقالات

حضرت حکیم سید مولنٰا برکات احمد صاحب ٹونکی

رحمۃ اللہ علیہ

از جناب مولنٰا سید مناظر احسن صاحب گیلانی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

(۳)

مقصدِ درس

حضرت کی خدمت میں مجھے آٹھ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے کبھی نہیں سنا کہ آپ کی اس درسی کوشش کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف شہرت نام ونمود؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ حضرت میں اس کا جذبہ بہت کم تھا، آپ چاہتے تو شہرت کی ایسی زمین آپ کے سامنے کھلی ہوئی تھی، کہ ان پر چل کر ایک ایسے مقام پر پہونچ جاتے جہاں سے نہ صرف دنیا کے مسلمان نہیں بلکہ غیر اقوام بھی آپ کو دیکھتے، حکیم اجمل خان مرحوم آپ کے بڑے دوست تھے، انھوں نے بارہا چاہا کہ ان کے ساتھ وہ میدان عمل میں اتریں، طبی مجاہدات میں ساتھ دیں۔ لیکن خاموشی کے سوا آپکے پاس کوئی جواب نہ تھا، حیدر آباد کے معین المہام مذہبی، نواب فضیلت جنگ، مولانا انوار اللہ خاں مرحوم آپکے مخلص عقیدتمند تھے، انھوں نے بارہا چاہا کہ دکن کی کسی سطحِ مرتفع پر آپ بھی اپنا میناره قایم کریں، لیکن آپ اپنی جگہہ سے نہ ہلے، مختلف ریاستوں کے رئیسوں نے بڑی بڑی تنخواہوں پر آپ کو بلایا، لیکن نہ گئے، مولانا شبلی مرحوم نے خود مجھے ایک دفعہ لکھنؤ میں بلا کر کہا کیا تمھارے استاد مولانا برکات احمد صاحب ہمارے دار العلوم کی صدر مدرسی پر آ سکتے ہیں، حضرت سے جاکر میں نے عرض کیا، تو ہنس کر ٹال دیا، اور کچھ جواب نہیں دیا، نہیں کہا جا سکتا کہ اندرون قلب میں اس غیر معمولی جد وجہد سے انھوں نے اپنا کیا نصب العین مقرر کیا تھا، تو اب آخرت بیشک ان کے نزدیک بڑی چیز تھی، اور جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی اور خوشنودی کیلئے علم دین کی نشر واشاعت میں مصروف تھے، تاہم ٹونک کے ایک بزرگ مرحوم سچے میاں جو حضرت کے دوست تھے ایک دن مجھسے بولے، کہ آج مولوی برکات احمد بہت خوش تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لئے قایم کیا تھا، سو الحمد للہ دو نشتر تو مجھے مل گئے انشاء اللہ ان سے بڑا کام نکلیگا، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی مراد نشتر سے کیا تھی اور یہ کون دو آدمی تھے جن کے متعلق حضرت کی یہ پیشینگوئی تھی، تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ حضرت کے سامنے بھی کوئی مقصد تھا، کامیابی اور ناکامی کسی اور کے ہاتھ میں ہے، لیکن انکی نیت میں کوئی خاص "سر" پوشیدہ تھا۔ وانما الاعمال بالنیات۔

دورِ تالیف

تقریباً بیس سال تک مختلف علوم وفنون کی مسلسل تعلیم ودرس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال حضرت نے اپنی توجہ درس سے زیادہ تالیف وتصنیف کی طرف پھیر دی تھی، ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں جن میں بعض تو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں، اور مختلف درسی کتابوں کے مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں، ایک ضخیم کتاب آپ نے الحجۃ البازغۃ کے نام سے لکھی، جسمیں مابعد الطبعیات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے، مولانا انوار اللہ خان مرحوم نے اسکو حکومت آصفیہ کی جانب سے شایع بھی کرا دیا ہے، ایک کتاب آپنے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی، یہ مولانا بحر العلوم کی شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے، کاش شایع ہو جاتی تو نصاب کیلئے بہترین کتاب ہے۔

آخر عمر میں آپ پر تصوف کا غلبہ ہو گیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں، جو سب کی سب غیر مطبوع ہیں، آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں بزبان اردو کچھ نوٹ کرائے تھے، جسکو باضابطہ مرتب کر کے صدقہ جاریہ فی رد آریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد صاحب نے شایع بھی کرا دیا ہے، اردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے، البعض نزاعی جزئیات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں، ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپنے آغاز کیا تھا، معلوم نہیں کہ مکمل ہوئی یا نہیں، بہرحال حدیث وتصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے، جسکی مانگ علم کے دور جدید میں مشکل سے ہوگی، یہ ممکن ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ہندوستان کی علمی اور ذہنی کیفیت نے پھر وہی ارتفاع پیدا کر لیا،

جو کسی زمانہ میں تھا، تو لوگوں کو ان کتابوں سے دلچسپی ہو، خیال ہے کہ اگر حضرت کی کوئی مفصل سوانحعمری کبھی شائع کی گئی، تو اسمیں ان کتابوں کے مسائل سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش کیجائیگی،

مجاہدات وریاضات جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے، حضرت میں تقوی، انابت، اخلاص اور عشق نبوی کے جواہرات ابتدا سے منور تھے، لیکن انکی آب وتاب اسوقت آیا جب علم وعقل سے آپ بالکل تھک کر بیٹھ گئے، یہ تو آپ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ رات کے ۳ بجے ساڑھے تین بجے اٹھ جاتے، تہجد کی نماز پڑھتے، پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے رہتے، صبح کی نماز ہٹو کی مسجد میں باجماعت ادا کرکے ایک خاص منظر قابل دید اسکے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک مسلسل زور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیۂ ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت لجاجت سے شروع فرماتے تھے، مسجد سے اٹھ کر گھر آتے، تانگہ تیار رہتا تھا، علی الصباح نذر باغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے، اور راستہ میں قرآن مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے، حضرت کی خدمت میں سنہ ۱۳۲۵ھ میں حاضر ہوا، اسوقت تک آپ کی مذہبی ریاضت کا یہی حال تھا، میں ٹونک ہی میں تھا کہ آپ پر حج وزیارت کا شوق مسلط ہوا، اور حجاز کے سوا، شام وفلسطین، کا سفر کرتے ہوئے آپ ہندوستان واپس ہوئے، اسکے بعد آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا، فقراء و درویش کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے، لیکن اسکے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہوگیا، اس عرصے میں آپ حیدرآباد ایک ضرورت سے تشریف لائے، یہاں تلاش فقر میں آپکی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہری شکل وصورت میں ایک معمولی سے آدمی ہیں اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے، لیکن فلسفہ ومنطق کے تمام نہنگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا، تو پچاس سال کے سارے سرمایہ کو انکے قدموں پر نثار کردیا، ان کا نام حضرت کمال شاہ صاحب عرف مچھلی شاہ صاحب مدظلہ العالی ہے، میں بھی ساتھ تھا، حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی، اسکے بعد حضرت آبدیدہ تھے، اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے، اور غالباً اس کے بعد ایک مہینہ تک حیدرآباد میں رہے، لیکن وقت کا اکثر حصہ انھیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے،

وہ کچھ کہتے جاتے تھے اور حضرت الاستاذ سنتے جاتے تھے،

یہ بزرگ مدراس کی جماعت صوفیہ کے ایک بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، انکے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ تصوف کے متعلق مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے، حضرت نے ڈھونڈھ کر یہ کتابیں مطبوعہ و قلمی مہیا کیں، اور شاہ صاحب سے ارشاد لیکر مراجعت فرماے ٹونک ہوئے، آخر زندگی میں ان کا شغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ، اور ان سے مطالب استنباط کرکے کئی کتابوں کی تدوین رہگیا تھا۔

افسوس ہے کہ اسکے بعد خدمت گرامی میں مجھے حاضری کی نوبت نہ آئی، لیکن لوگوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کا یہ آخری رنگ بہت گہرا اور سخت انقلاب انگیز تھا، مزاج میں حد درجہ کی نرمی اور دارفتگی پیدا ہوگئی تھی، خود حضرت مچھلی شاہ صاحب نے مجھ سے بار بار فرمایا کہ تمھارے استاد کو میں عالم مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر ایک تاجِ زرنگار ہے، اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کئے گئے، یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ صاحب ان کی زندگی میں فرماتے تھے،

اس زمانہ کے اندرونی ریاضات ومجاہدات کا مجھے تفصیلی علم نہیں ہے، جن خوش نصیبوں کو اس دور میں آپ کی رفاقت نصیب ہوئی، کاش وہ اسکی تکمیل فرما دیتے۔

یہ تو حضرت کے علمی اور دینی شعبہ کا ذکر تھا، مناسب ہوگا کہ آخر میں آپ کی زندگی کے بعض جزئیات کو بھی یہاں درج کردیا جائے۔

سخاوت حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی، طالب علموں کے ساتھ جو برتاؤ تھا معلوم ہوچکا، اسکے سوا غریبوں، بیواؤں، دوستوں کے ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے، خصوصاً عزیزوں کے ساتھ آپکا سلوک بالکل غیر معمولی تھا، تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہروں میں تقسیم کردیا جاتا تھا، اخیر عمر میں عربوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت غالب ہوگیا تھا، محبت رسول کی آگ

جوں جوں تیز ہوتی تھی، دیار محبوب کا ہر آنے والا آپ کو بیچین کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی شوق کے زیر اثر آپ نے چند سال پہلے عربوں کے لئے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف سے تیار کرائی تھی، اور اس کا نام "رباط" رکھا تھا، جسمیں ہر قسم کے آرام کا سامان آپ کی جانب سے تھا، ٹونک میں جو عرب آتا، خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا، تو اسکے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرتے، خود دیتے، امراسے دلاتے، اور نواب صاحب ٹونک سے کچھ نہ کچھ وصول کرکے ان عربوں کو دلوانا اپنے اوپر لازم کرلیا تھا، خاکسار کے نام آخری خط اپنے وصال سے پندرہ دن پیشتر ایک عرب ہی کی سفارش میں بھجوایا تھا، بہرحال آپ کی عام اخلاقی صفات میں جود کی صفت آپ پر بہت نمایاں تھی،

سادگی اور وارفتگی و استغراق

لباس - سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے، معمولی چار آنے پانچ آنے گز کا کرتہ اور پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے، اور یہ بھی بہت بری حالت میں آپکے جسم پر نظر آتا تھا، مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی، درس گاہ میں کبھی کبھی الٹا پاجامہ پہنکر آتے، مونڈھے پر کرتہ کا ایک حصہ پان کی پیک سے تر رہتا تھا، پان کھانے کی عادت بہت زیادہ تھی، درس کے وقت عموماً منہ سے چھالیا، اڑ اڑ کر طلبا کی کھلی کتابوں پر گرتی، خصوصاً قاری کی کتاب تو بالکل سرخ ہوجاتی تھی، کیونکہ طرہ یہ ہوتا تھا کہ خود اپنے دست مبارک سے اسکو پوچھ بھی دیتے تھے، آپ کی وارفتگی کے قصے بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک دن حمام سے بغیر کسی کپڑے کے باہر نکل آئے، لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ نواب صاحب ٹونک کے سامنے ایک دن بجائے عمامہ سر پر پاجامہ باندھ کر چلے گئے، نواب صاحب کے ٹوکنے پر متنبہ ہوئے، یہ بھی بسا اوقات ہوا کہ کسی نے آپ کو نیس دی، رومال جو کندھے پر اکثر ڈالے رہتے تھے، اس کے کونے میں روپیہ باندھ دیتے لیکن اس طرح کہ رومال میں گرہ پڑ گئی مگر روپیہ باہر ہی رہا، جس کا جی چاہتا تھا، لے لیتا تھا، رحم آیا تو دیدیا، علمی انہماک اور فکری استغراق کے بعد "مخرقاتِ امور" میں اس قسم کے افعال کا صادر ہونا علم کی تاریخ میں نادر نہیں ہے،

قناعت اور یہ بات زیادہ تر اس لئے تھی کہ مزاج میں حرص کا شائبہ بھی نہ تھا، مہاراجہ اندور نے مختلف ذرائع سے آپ پر زور دیا کہ میں بارہ سو روپیہ ماہوار آپ کو تنخواہ دوں گا، اور اسکے سوا اور بھی وعدے تھے لیکن آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا، کہ مہاراجہ کیا کہتا ہے، ان باتوں کا اثر نواب صاحب ٹونک پر بہت پڑتا تھا خود فرماتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دونگا، حالانکہ ان کا یہ عجیب خیال ہے، حیدرآباد دکن آئے تھے تو نواب صاحب لپٹ کر حکیم صاحب سے کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب جانے کو تو جاتے ہو لیکن مجھے نہ چھوڑ دینا، بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن ہی کرکے جانا، کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے، انھوں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمایش کا پیش آیا تھا، اس وقت چاہتے تو بیسیوں لاکھ روپئے جائز ذریعہ سے آپ کو مل جاتے، لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بری طرح ٹھکرا دیا،

مراء و جدال سے نفرت

حضرت کا خاص فن منطق اور فلسفہ تھا، جس کا اکثر حصہ صرف جدلیات و مکابرات پر مبنی ہے، اور عموماً منطقی اور فلسفی کے معنی کم از کم قدیم اصطلاح میں جھگڑالو کے تھے، اس زمانہ میں جو عالم اپنے کو منطقی کے خطاب سے موصوف کرتا تھا، اسکے لئے ضرور تھا، کہ وہ اپنے معاصرین سے ذہنی و لسانی جنگ کرے، لیکن حضرت پر جہاں خدا کا اور فضل تھا، اسمیں ایک یہ بھی تھا کہ فی عمرہ آپنے ہندوستان کے کسی عالم سے بانی مناظرہ نہیں فرمایا، بدقسمتی سے رئیس رامپور کو ایک زمانہ میں مولوی بازی کا شوق ہوگیا، رامپور میں کئی لڑائیاں دنگل ہوئے، اسی سلسلہ میں کسی نے نواب کو حضرت کی طرف توجہ دلائی، انھوں نے آپ کو بلوا کر مشہور جدالی منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری مرحوم سے بھڑا دیا، حضرت اس میدان کے مرد نہ تھے، آپ نے تو سنجیدہ پیرایہ میں اصول کے ساتھ گفتگو شروع کی، لیکن مرحوم منطقی نے اپنے جالجوجی پیتروں سے آپ پر حملہ شروع کر دیا، آخر میں فیصلہ کے متعلق حاضرین میں اختلاف ہوگیا - بعض حضرت کی فتح کے نقارچی تھے، اور بعض مولوی عبدالوہاب کے ڈفالی، لیکن واقعہ یہ تھا کہ تقابل کے لئے نسبت شرط ہے، اور مولوی عبدالوہاب مرحوم اور حضرت کی فطرت و نہاد میں کوئی نسبت نہیں تھی، بیٹی جوتہ سے بہتر ہے یا قلم گوشت سے افضل ہے، آخران بے جوڑ۔ انمل باتوں میں مناظرہ کرنا یا کرانا خود اپنی کوتاہ عقلی ہے، اخبارات و رسائل میں مولوی عبدالوہاب مرحوم نے

انہوں نے اس مناظرہ کا مشاعیہ کیا تھا، لوگوں نے حضرت کی طرف سے ذب و مدافعت بھی کی، لیکن خود آپ بالکل خاموش تھے، بہرحال زبانی مناظرہ عمر بھر میں صرف یہ ایک ہی دفعہ ہوا، البتہ بعض عقلی اور چند مذہبی تحریری آپ میں اور آپکے معاصرین مولانا فضل حق رامپوری اور شمس العلما مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہ میں نوک جھوک ہوئی نیز بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپنے کبھی کبھی کچھ لکھا، لیکن ساٹھ برس کی عمر میں یہ چند تنازعات ہیں اور یہ بھی کسی خاص فوری جوش یا ہیجان کا نتیجہ تھا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں سے اللہ نے آپ کو بہت ارفع و اعلیٰ پیدا کیا تھا،

حضرت کے تلامذہ

اس عنوان کی حقیقی تفصیل ایک ضخیم رجسٹر کو چاہتی ہے لیکن جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں، اجمالاً یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وسط ایشیار، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے شروع کرکے تم بنگال کے آخری حدود تک چلے جاؤ، تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا، اور اچھی حالت میں نظر آئیگا، بیرون ہند سے آپکے پاس طلبہ خاص کر اس لئے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوانساری، میر باقر داماد کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو اس زمانہ میں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام میں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں اور ماوراءالنہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابوں کے پڑھنے کا خاص ذوق تھا،

علمائے ہند میں مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمان ٹونکی، مولنا نصیر احمد بھلتی، مولنا حمید الرحمن چشتی حیدرآبادی، مولنا اشرف ملتانی، مولنا عبدالسبحان بہاری، مولنا مقبول احمد دربھنگوی مولنا محمود سندھی، مولنا عبیداللہ الاعظم البہاری، مولنا عبدالحمید ترہتی، مولنا شریف مبارکپوری، مولنا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولنا احمد کریم بہاری، مولنا عبدالواسع وغیرہم حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں اکثر ہندوستان کے مرکزی مدارس کے صدر مدرس یا مدرس ہیں، اور اسلامی علوم کے حلقہ علمی میں وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں؎

اہل و عیال

حضرت کی پہلی شادی جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے میرنگر میں ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، ان سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے، ان کے بعد بہار ہی کے ایک بزرگ مولنا عبدالرحمن صاحب ساکن تیترہشہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا، حضرت کی بیوی صاحبہ حقیقت یہ ہے کہ ان گرامی قدر خواتینِ اسلام میں سے ہیں جنہوں نے اپنے کو علم و دین کی خدمت میں اپنے شوہر کا دستِ راست ثابت کیا، بیوی صاحبہ حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات اور ان کے قیام و طعام کا تیس پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انھوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا، یہ مبالغہ نہیں ہے، کہ بعض بعض دفعہ انھیں غریب السیار طلبہ کے مصارف کے سلسلہ میں بیوی صاحبہ کو اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑے تھے، فجزاہا عنا وعن المسلمین خیر الجزاء، اگر وہ نہ ہوتیں تو برکاتی سلسلہ کے ان علمبرداروں کو علمی آبادیوں میں شاید ہم نہیں پاسکتے تھے، آپ ہی حضرت کے خلف رشید مولنا حکیم محمد احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ ماجدہ ہیں، اور محمد میاں صاحب کے سوا حضرت کی کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں ہے، لیکن جسکی علمی ذریت زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو، کیا ہوا اگر ایک اکلوتے بچے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ؎

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر — یادگارے کہ درین گنبد دوار بماند

مولنا حکیم محمد احمد صاحب علماً و منصباً، دنیاً و عملاً، اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین ہیں، اب والی ٹونک خلد اللہ ملکہ، کے معالج خاص ہی مقرر ہوئے ہیں، اور حضرت کی جگہہ درس و تدریس کی عنان آپنے اپنے ہاتھ میں لی ہے، اللہ ان کی عمر میں برکت دے، اور توفیق عطا فرمائے، کہ اپنے والد کی تمام خصوصیات کی روح تک ان کی رسائی ہو، ؎

درمجلس و صالت خمہا کشند مستان — چو دور خسرو آمد می در سبو نماندہ

ونعوذ باللہ من الفتن ما ظہر منہا و بطن۔

وفات

سر سٹھ برس کی عمر کے بعد یکایک آپ ہستی کی اس منزل پر پہونچ گئے جہاں انسان دنیا میں غروب ہو کر آخرت میں طلوع ہوتا ہے، حضرت کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے نجل سعید خلف ارشد، مولانا محمد احمد صاحب کے اس مطبوعہ خط کو نقل کردوں جسے انہوں نے اقطارِ ہند کے عام تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرمایا تھا ارقام فرماتے ہیں[1]:-

"جناب محترم ..... السلام علیکم وعلی جمیع من اتبع الھدیٰ، آنجناب کا تار و مکتوب گرامی بسلسلۂ تعزیت و بطلب حالات مفصل علالت و وفات والدی سراج الملۃ والدین حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب ممنونیت و تسکین خاطر حزین فقیر حقیر ہوا، جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمہ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ضعفِ معدہ کی شکایت تھی، سال گذشتہ اسی حالت میں بیتابانہ و پروانہ وار زیارت سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم و حج ثانی کے لئے روانہ ہوگئے، چونکہ موسم نہایت تیز و تند تھا، اور طبیعت پہلے ہی سے مضمحل تھی، اس لئے اسہالِ معدی میں زیادتی پیدا ہوگئی، سفر مبارک سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلۂ اسہال جاری رہا، غذا بجائے دو وقت کے ایک وقت ہوگئی، ریاضت کی کثرت، درس و تدریس میں پوری محویت، تصنیف و تالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا، اور مرض الموت کی ابتدا یوم عید الفطر ۱۳۴۶ ہجریہ سے اس طرح شروع ہوئی کہ شدت سے دفعۃً بخار ہوگیا، اور کامل تیس روز تک مفارق نہ ہوا، اور پھر ورم جگر، سوء القنیہ ہو کر نوبت باستسقا رسید، امراض کا اس طرح ہجوم تھا، مگر وہاں صحت جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا، جو ہمیشہ رہا، اور جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہونچا دیا، تکالیف کے اخفا کی اس طرح کوشش جاری تھی، ذکر و شغل، حبس دم، پاس انفاس، کا سلسلہ برابر جاری تھا، اسی وجہ سے دو مرتبہ قی الدم بھی ہوئی، ماہ صفر کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی شدت ذبل

[1] یہ گرامی نامہ نیاز مند کے پاس اس جملہ کے ساتھ آیا تھا "سب سے پہلے [illegible] بھیجا جاتا ہے"۔

تونیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی، جس کی کمزور جسمانیت تاب نہ لاسکی اور آفتاب فضل و کمال غرۂ ربیع الاول ۱۳۴۷ ہجری شب کے ۳ بجے غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون —

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ "میرے مدرسہ اور رباط کا پوری طرح خیال رکھنا، درس و تدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قایم رکھنا، میرے والد ماجد (حضرت مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضروری جاری رکھنا، میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا"، دورِ علالت کامل ۵ پانچ ماہ قایم رہا، مگر ایک روز بھی مشغلہ علمی ترک نہ ہوا، جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا اخیر دن اور یوم الرحیل تھا، جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو التعرف فی حقیقۃ التصوف کے مطالعہ میں مستغرق تھے، انھیں ایام علالت میں جن عمیق علمی تصانیف فرمائیں، جن کا اختتام زندگی کے لمحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے، اور جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے،

اس کے بعد کتاب کے نام اور مسائل کا ذکر ہے آگے ارقام فرماتے ہیں،

یوم الرحیل میں برابر عصر سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق جوق لوگ آتے رہے، نہایت متبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقین و ارشاد میں مصروف رہے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد عشار تک ورود و وظایف کا سلسلہ جاری رہا، اور عشار کے بعد خلاف معمول مدت دراز کے بعد تناول طعام فرمایا، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا، پھر پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو کر ۲ بجے تک اولاً تلاوت قرآن شریف اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے، دو بجے سے جہر کی شدت میں فرق آنا شروع ہوا، اور یٰسین شریف جو ایک مدت سے رات کو پڑھی جا رہی تھی ختم کرائی، پھر ذکر میں مصروف ہوئے تا آنکہ ٹھیک ۳ بجے اسی حالت میں جان بحق تسلیم ہوئے، اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی، جس کی تذکیر و تلقین سے

عالم گونج اٹھا، خدا جانے یہ کیا اسرارِ الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں میں ایسی غیر معمولی چمک [illegible]
اور جاذبیت پیدا ہوگئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے اسکا احساس کر لیا تھا، اور ایک دوسرے سے
متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے، آہ وہ آنکھیں سوا بجے شب کو ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں، لیکن قلب برابر ۸ بجے تک
جاری رہا، عوام اس واقعہ کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے، اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے سه

الحمد ٹھکانے لگی محنت ان کی

حکام ریاست نے تمام دفاتر سرکاری میں جنازہ و نماز جنازہ میں شرکت کے واسطے
عام اجازت دیدی، اور دار العلوم خلیلیہ میں نماز اولیٰ ادا ہوئی، چوک دفاتر کے قریب صحرا میں نماز
ثانی ادا ہوئی،

دوسرے روز حسب فرمان خسروی ریاست میں تعطیل عامّی ۱۹ اگست سنہ ۱۹۳۸ء کو دی گئی،

آگے مولانا نے کچھ اپنے حالات لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت
میں نواب صاحب ٹونک بہ نفس نفیس آپ کے مکان تشریف لائے اور جن فرائض کا تعلق حضرت مرحوم سے تھا وہ
آپ کے اکلوتے اور رشید صاحبزادے کے سپرد کئے گئے، اسوقت مولانا حکیم محمد احمد صاحب کی تنخواہ چار سو روپیہ [illegible]
ہے، اور جاگیر میں وہی قدیم گاؤں ٹھکریہ ہے، فاللّٰھم زد فی عمرہ و بارك و متعنا والمسلمین بطول بقائه

اب حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ کے نفس ذکی روح صافی کی طرف فاتحہ کے ساتھ متوجہ ہو کر بجز اس
کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں،

سابکیک ما فاضت دموعی فان تغض
فحسبك منی ما تجن الجوانح

کینٹ کے سوانح حیات

اور

اوسکے فلسفہ کی اہمیت

مرتبہ پروفیسر یوسف سلیم مرے کالج سیالکوٹ

یہ مشہور فلاسفر ۲۲ اپریل سنہ ۱۷۲۴ء کو کونگز برگ واقع پروشیا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ جان جارج ایک
معمولی حیثیت کا آدمی تھا، زین سازی کا پیشہ کرتا تھا، اور چچا موچی تھا لیکن تھا مالدار، کینٹ کی پہلی تصنیف اسی کی
[illegible] سے شائع ہوئی تھی، کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ زین ساز کے گھر میں ایسا باکمال پیدا ہوا جس کے سامنے ارسطو اور
افلاطون کے کارنامے ماند پڑ گئے۔ قدرت کی نیرنگیاں اسی طرز پر ظہور پذیر ہوتی آئی ہیں، آذر بت تراش کے گھر ایسا باکمال
پیدا ہوا جس نے توحید کا ڈنکا تمام عالم میں بجا دیا۔ نپولین کا باپ، ہینی بال کا باپ۔ رضا خاں کا باپ،
[illegible] کمال کا باپ یہ سب معمولی حیثیت کے لوگ گذرے ہیں، خود جرمنی میں کینٹ کے علاوہ فیشنگ تھان ایک اسلحہ
ساز کا بیٹا تھا اور وولف کا باپ چمڑہ پکایا کرتا تھا،

کینٹ کے والدین بہت دیندار اور خدا ترس تھے اور اس کی ماں تو گویا مذہب کی شیدائی تھی۔ دن رات عبادت
و مطالعہ میں بسر کرتی تھی۔ لازمی طور پر کینٹ اپنی ماں کی دینداری سے متاثر ہوا چنانچہ مذہبیت کا عنصر تا دم مرگ اس سے
دور نہ ہو سکا۔ جوانی اور بڑھاپے دونوں میں اسے بچپن کی پاکیزہ زندگی یاد آیا کرتی تھی، اپنی تحریروں میں تقریروں میں
[illegible] مذہبی اور اخلاقی فضا کا بڑے پسندیدہ الفاظ میں ذکر کیا ہے جس میں اسکی پرورش ہوئی تھی، سب سے عمدہ تعلیم
جو اس کو اپنی ماں کی طرف سے ملی یہ تھی کہ ضمیر کی آواز پر کان دھرو اور اسکی اطاعت کرو۔ جس بات پر ضمیر ملامت کرے
اسے آئندہ ہرگز نہ کرو۔ کینٹ اپنی تمام عمر اپنی ماں کا مداح رہا اور اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ "میری ماں فطرتی
طور پر عاقلہ، نیکدل اور دیندار تھی اور اسکی زندگی نے میرے اندر زبردست تبدیلی پیدا کر دی" کینٹ ایسی نیک

اور پاکیزہ طینت ماں کی جس قدر تعریف کرتا کم تھی - کیونکہ اسی نے کینٹ کے دماغ میں سچائی کی طلب اور پاکیزہ
زندگی کی خوبی کی اہمیت کو جاگزین کیا اور حتی الوسع اسکی تربیت کے علاوہ تعلیم کی بھی فکر کی، عموماً وہ پادری
ایف - اے - شلز کے مواعظ سنا کرتی تھی، یوں بھی دینی گفتگو کیلئے اس کے گھر جاتی تھی، چھوٹا بچہ ساتھ ہوتا، پادری
موصوف اس پر بھی شفقت فرماتے، ماں کی آرزو تھی کہ میرا بچہ بھی میری طرح دیندار اور عالم ہو - ضرور ساتھ [illegible]
ہوگی، پادری صاحب نے کینٹ کی والدہ کو صلاح دی کہ اسے اسکول میں داخل کردو، چونکہ ذہین اور طباع معلوم ہوتا ہے
اُس کے اخراجات میں خود برداشت کروں گا، اور کوشش کرونگا کہ وظیفہ ملجائے، یہ پادری یونیورسٹی میں الٰہیات اور [illegible]
کا پروفیسر تھا اور ہائی اسکول کا منتظم، چنانچہ آٹھ سال کی عمر یعنی ۱۷۳۲ء میں کینٹ اس اسکول میں داخل ہوا اور [illegible]
انٹرنس پاس کرکے یونیورسٹی میں داخل ہوا - کالج میں آکر لاطینی زبان میں خوب مہارت بہم پہونچائی - اسکے علاوہ منطق [illegible]
فلسفہ ڈگری کیلئے اختیار کیا، افسوس اس بات کا ہے کہ اسکی ماں ۱۷۳۷ء میں انتقال کرگئی اور اپنے ہونہار بیٹے کی کامیابی
کا مشاہدہ نہ کرسکی -

کینٹ کی کالج کی زندگی کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں، وہ اپنے پروفیسروں میں مارٹن نوزن کو
سب سے زیادہ محبوب رکھتا تھا - کیونکہ یہ شخص مابعد الطبیعات اور ریاضی میں بہت مہارت رکھتا تھا، اور یہ دونوں
مضامین کینٹ نے اسی سے حاصل کئے، کینٹ فلسفہ کا عاشق تھا، اسلئے نوزن بھی اس پر بہت مہربان تھا، [illegible]
کے وقت تنہائی کے عالم میں نوجوان کینٹ اپنے شفیق استاد کے کمرہ میں بیٹھا فلسفہ کے مختلف مباحث پر اظہار خیال
کیا کرتا اور استاد ہر طرح اسکی ہمت افزائی کرتا، درسی کتابیں خریدنے کی اسے ضرورت نہ پڑی، نوزن کی [illegible]
اسکے لئے وقف تھی، دن رات مطالعہ میں مشغول رہا کرتا، نوزن نے اسے نہ صرف مابعد الطبیعات پڑھائی بلکہ
طبیعات ہیئت اور اقلیدس میں بھی خاصی مدد دی، کالج کی زندگی میں کینٹ کی توجہ ریاضی، سائنس اور علم [illegible]
ان تین مضامین کی طرف مبذول رہی، رہا فلسفہ تو یہ تو اسکی غذائے روح تھی، ان علوم کے علاوہ جب موقع ملتا تو
پادری شلز کے لکچر سننے چلا جاتا، جو زیادہ تر علم عقاید اور علم کلام سے متعلق ہوتے تھے -

۱۷۴۶ء میں کینٹ نے ڈیکارٹ اور لیبنز کے ان خیالات پر جو انھوں نے "قوۃ" پر ظاہر کیے تھے ایک فاضلانہ
محاکمہ سپرد قلم کیا اور اسے باضابطہ شعبہ عقلیات کے رئیس کی خدمت میں پیش کیا، یہ محاکمہ کینٹ کی آیندہ
[illegible] کا پیش خیمہ تھا - اسی سال اسکے باپ نے وفات پائی -
جب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اس محاکمہ کا بامعان نظر مطالعہ کیا تو اس نوجوان کی قابلیت ذاتی اور تجربہ
[illegible] صائب رائے اور جودت طبع پر عش عش کر اٹھے - واقعی بات بھی یہی ہے کینٹ کی عمر اسوقت صرف ۲۲ سال
[illegible] میں عموماً لوگ پڑھا کرتے ہیں، پڑھایا نہیں کرتے - بلکہ اکثر نوجوان تو ایسے ہوتے ہیں جو ڈیکارٹ اور
[illegible] کی تصانیف بھی ختم نہیں کرپاتے - واضح ہو کہ ڈیکارٹ اور لیبنز بہت زبردست فلاسفر اور علمی قابلیت
[illegible] گذرے ہیں، ان کے خیالات پر تبصرہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، ڈیکارٹ کا فلسفہ جدید میں وہی مرتبہ ہے
[illegible] فلسفہ قدیم میں، اور لیبنز اپنے زمانہ کا فاضل ترین شخص گذرا ہے جو ہر فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور وحید العصر تھا
[illegible] یونیورسٹی سے فراغت پاکر کینٹ کو قوت لایموت کی فکر دامنگیر ہوئی، کیونکہ والدین کا انتقال ہوچکا تھا
[illegible] موجود نہ تھا - سچ تو یہ ہے کہ کینٹ کا زمانہ تعلیم نہایت عسرت کی حالت میں بسر ہوا اور اگر اسے علم سے شغف
[illegible] برسوں پہلے تعلیم کو خیرباد کہہ چکا ہوتا، بسر اوقات کیلئے ایک پادری کے یہاں بچوں کو پڑھانے لگا، اسکے بعد
[illegible] کے صاحبزادوں کا اتالیق ہوگیا، چند ماہ کے بعد خوش قسمتی سے کاونٹ کیسرلنگ کے خاندان سے تعارف
[illegible] موصوف کی بیگم نہایت علم دوست اور نیک نہاد عورت تھی، اس نے نوجوان کینٹ کی قابلیت کا اندازہ
[illegible] میں کرلیا، اور چند روز کی واقفیت کے بعد کینٹ اس کا ہم جلیس بن گیا، بیگم کی مہربانی سے کینٹ کو فکر
[illegible] آزادی ہوگئی - شام کے وقت گھنٹہ بھر اسکو اپنی لیاقت اور معلومات سے محظوظ کردیتا تھا، وہ اسکے عوض
[illegible] میں حسن سلوک کردیتی تھی، گویا کینٹ کو مطالعہ کا وقت بھی ملا اور اتنا روپیہ بھی کہ ضروری کتابیں
[illegible] بہرحال آٹھ سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد کینٹ نے بیگم کیسرلنگ کی سفارش اور اپنی علمی شہرت کی بنا پر
[illegible] یونیورسٹی میں ادنی لکچرار کی خدمت حاصل کرلی، اور اسکی عسرت و بے اطمینانی کا زمانہ ختم ہوا، اس زمانہ میں

یونیورسٹی میں ادنیٰ لکچراری کے لئے بھی بڑی بڑی قیود لاحق ہوا کرتی تھیں چنانچہ تقرر کے لئے
لیب نز کے فلسفہ پر ایک زبردست اور سیر کن تنقید لکھکر یونیورسٹی کے فضلاء کی خدمت میں پیش کی
میں کامیاب ہونے کے بعد ۱۷۵۵ء کے موسم سرما سے کینٹ نے اپنا مرغوب طبع کام شروع کیا یعنی فلسفہ کا درس
اس زمانہ میں عام قاعدہ تھا کہ جب تک کسی شخص کی شہرت علم و فضل میں مسلم نہ ہوجاتی اسے یونیورسٹی میں لکچرر
تھی اور اسکے علاوہ جو مضمون اس کے سپرد ہوتا اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھنا پڑتا تھا تاکہ یونیورسٹی کو یقین ہو
کہ جس شخص کا تقرر کیا گیا ہے وہ اپنے مضمون کو پڑھا سکتا ہے۔ الغرض کینٹ پندرہ سال تک لکچراری کی تنخواہ
کام کرتا رہا، اس عرصہ میں دو مرتبہ اس نے پروفیسری کی کوشش کی لیکن ناکام رہا، اس سے معلوم ہوسکتا ہے
زمانہ میں پروفیسر کا عہدہ کس قدر وقیع ہوگا، بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی کو دیکھئے بڑے بڑے عالم اس
کی آرزو میں مرگئے، میرے روحانی استاد علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے الغزالی میں لکھا ہے کہ ایک
فاضل عصر نظامیہ کی صدر مدرسی کی آرزو رکھتے تھے اور اس منبر کی طرف، جس پر صدر بیٹھکر درس دیتا
کرکے اشعار پڑھا کرتے تھے۔

۱۷۶۴ء میں برلن یونیورسٹی میں ادبیات (نظم) کے پروفیسر کی جگہہ خالی ہوئی، کینٹ فلسفہ کے
لاطینی اور یونانی ادب کا بھی بہت بڑا ماہر تھا اسلئے یہ جگہہ اسے پیش کیگئی، لیکن اس نے انکار کر دیا اس انکار کی
میری سمجھ میں آتی ہیں ایک تو یہ کہ کینٹ فلسفہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مضمون کی طرف توجہ کرنا پسند نہ
وہ جانتا تھا کہ اگر شہرت اور خدمت کا موقع ملے تو فلسفہ میں، دوسرے وہ بالطبع وطن دوست تھا اب
سے باہر جانا اسکے مزاج کے خلاف تھا۔

فی الجملہ کینٹ نے اپنا کام نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دینا شروع کیا تھوڑے ہی دنوں
اسکی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی، اس کے لکچر عام طور پر پسند کئے جانے لگے اور اسکی جاذبیت کا یہ عالم ہوا
ایکطرف شہر کے علم دوست اصحاب جوق جوق انھیں سننے اور استفادہ کرنے آنے لگے اس زمانہ میں کینٹ

طبیعات، ریاضی، اور نیچرل سائنس پر لکچر دیا کرتا تھا۔ چونکہ اسے طبیعات سے بھی فطرتی لگاؤ تھا،
کے اوقات میں اس فن کا مطالعہ کیا کرتا، اور جغرافیہ کو طبعی زاویہ نگاہ سے دیکھنا اور جغرافیہ طبعی کو درسیات
اسکی جودت طبع کا رہین منت ہے، یونیورسٹی میں جغرافیہ طبعی کو داخل درس کرنے کا سہرا کینٹ کے سر ہے،
کے آخر میں کینٹ نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ فطرت اور نظریۂ فلکیات شایع کی، یہ کتاب نیوٹن کی
علمی کا تکملہ سمجھنا چاہیے، اسکے دیباچہ میں اس نے طبیعات اور مذہب کے باہمی تعلق پر جو اظہار خیال کیا
توجہ کا مستحق ہے، وہ کہتا ہے کہ "مذہب کو مظاہر فطرت کی تشریح سے کوئی سروکار نہیں، نیچرل
علوم طبیعی اور معتقدات مذہبی ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں اگر انھیں باہم مخلوط کیا جائے
لیئے مضر ہوگا"۔

وہ زمانہ تھا جبکہ علمی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہو رہا تھا، اور جرمنی کے عقلاء اور حکماء، سقراط
بیکار بند ہو رہے تھے، یعنی قدیم مسلمات کی جانچ پڑتال شروع ہوگئی تھی، علم کلام کے فرسودہ مسائل
سے طبائع خود بخود نفور ہوتی جارہی تھیں، ہیوم کے فلسفہ اور روسیو کے خیالات لوگوں میں
کی روح پھونک رہے تھے، کینٹ بھی ان دونوں کی تصانیف سے متاثر ہوا اور ایک موقع پر
کا اعتراف بھی کرتا ہے جو روسیو کی تحریر سے اسمیں پیدا ہوا، لکھتا ہے "میں فطرتی طور پر محققانہ
ہوں، اور میری طلب علم کی کوئی حد نہیں ہے لیکن اس رجحان طبعی کی بنا پر جو خیال میں نے اپنے دل
تھا کہ طبقہ محققین کے علاوہ دوسرے لوگ اس دنیا میں بیکار محض ہیں، وہ روسیو کے مقالات پڑھ کر
ہوا اور میں اس کا شکر گذار ہوں کہ اسکی تصانیف سے میرے غلط خیال کی اصلاح ہوگئی اور اب میں
ہوں کہ فلسفہ اور سائنس دونوں چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ انکو اس لئے حاصل کرنا چاہیے کہ
بنی نوع آدم کے اخلاق کو آراستہ کیا جائے، انسانیت کو برتر مقام پر پہونچایا جائے اور لوگ
انسان کہلا سکیں، لیکن علم کی قیمت بلحاظ نفس علم کچھ نہیں اگر وہ علم انسان کے اخلاق خوشگوار

انقلاب پیدا نہ کرسکے' دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ کہ انسان کی اخلاقی حالت کو اسکی ذہنی حالت پر فوقیت
حاصل ہے اور یہ حقیقت مجھ پر روسیو کے مطالعہ سے منکشف ہوئی"۔

اس جگہہ مجھے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا وہ روح پرور قول یاد آگیا جو کینٹ جیسے
گمگشتگان وادی حیرت کیلئے خضر طریقت کا کام دیتا ہے اور طالبان حقیقت کیلئے آب حیات سے بھی گراں
کینٹ کو کیا خبر تھی کہ جس بات کیلئے وہ روسیو کی تعریف میں رطب اللسان ہے وہ اور اس سے
برتر حقائق و معارف اب سے تیرہ سو سال پہلے ایک امیؐ کی زبان وحی ترجمان پر بنی نوع انسان کی
بہبودی کیلئے شب و روز اٹھتے بیٹھتے جاری رہتے تھے۔

اسی حقیقت کی طرف ہمارے آقا اور مولا ہادی دوجہاں سردار انس و جان صلوٰۃ اللہ علیہ
الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں۔

اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع — اے خدا مجھے اس علم سے بچا جو میری روح کیلئے نفع

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کی نگاہ دوربین میں علم وہ علم جس کا کینٹ حامی تھا مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود بالعرض
انسان کو بہتر و پاکیزہ تر بنائے وہ حضور کے زاویہ نگاہ کے مطابق علم ہی نہیں' یعنی حضور کی رائے میں علم
نفس اور تزکیہ باطن کا نام ہے' میں مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا فرض یاد دلادوں تو آگے چلوں' آج
ہیں بہت سے کینٹ سچائی کیلئے بیتاب ہیں اور ان کے قلوب واقعی طور پر تثلیث، تجسیم، کفارہ
گناہ، استدراج ربانی' وغیرہ سے سخت بیزار ہیں، کیا فرزندان توحید کا یہ اولیں فرض نہیں کہ آنحضور
پاکیزہ و حیات بخش اقوال یورپ کے سامنے پیش کریں' انھیں کیا پتہ کہ جن باتوں کو وہ برسوں تحقیق و
بعد معلوم کرتے ہیں اور پھر ان حقایق کی دریافت کا سہرا زید و بکر کے سر رکھتے ہیں وہ اور ان سے بہتر
پہلے اس قدسی نفس انسان کی معرفت ہمیں مل چکے ہیں جس کی بعثت کا مقصد ہی تکمیل مکارم اخلاق

اس موقعہ پر ہم کینٹ کی علمی سرگرمیوں کا نقشہ اسکے قابل شاگرد ہرڈر کی تحریر سے جو

ہرڈر نے قریب تین سال کینٹ سے فلسفہ اور سائنس کا درس لیا وہ لکھتا ہے:۔

"میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میرا استاد[1] ایک اعلیٰ درجہ کا فلاسفر تھا جو بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی
رکھتا تھا، اس کے چہرے پر ہمیشہ شادمانی اور اطمینان برستا تھا، اس کی گفتگو ہمیشہ عالمانہ اور سنجیدہ ہوتی
باوجود فلسفی اور متین ہونے کے وہ بڑا بذلہ سنج اور ظریف تھا اور اسکے لکچر ہمیشہ بیحد جاذب توجہ ہوتے
اگر مابعد الطبیعات میں وہ لیب نز، وولف، بام گارٹن، اور ہیوم کے فلسفہ پر تنقید کرتا تھا تو طبیعیات میں
اور کیپلر کے کارناموں پر تبصرہ کرتا تھا، جس خوش اسلوبی سے وہ یونانی اور لاطینی ادب پڑھاتا تھا اسی
کے ساتھ جرمن اور فرنچ ادبیات بھی پڑھاتا تھا۔ وہ ارسطو سے بھی واقف تھا اور روسیو سے بھی، وہ
لیکچروں میں مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، طبیعیات، ہیئت، ریاضی، اور ذاتی تجربہ کی رنگ آمیزی
کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسکی تقریر بھی دلپذیر ہوجاتی تھی' اور توجہ سے سنی جاتی تھی۔ یہ شخص جس کا
حرف بلکہ جس کا نام بھی میں ہمیشہ انتہائی عزت کے جذبات کیساتھ لیتا ہوں' ایمینوئل کینٹ ہے'
صورت میری آنکھوں میں پھرتی ہے اور اسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں"۔

واضح ہو کہ ہرڈر خود اپنے زمانہ کا بڑا عالم اور فاضل شخص گذرا ہے۔

۱۷۷۰ء میں کینٹ کو فلسفہ کی پروفیسری ملی گویا حق بحقدار رسید، اس سے چند سال پہلے دوسری یونیورسٹیوں
نے بھی فلسفہ کی کرسی پیش کیجا چکی تھی' لیکن کینٹ نے اپنے وطن سے باہر جانا مناسب نہ سمجھا' اسلئے
کر دیا۔ ۱۷۷۸ء میں پروشیا کی سب سے مشہور یونیورسٹی Halle میں فلسفہ کی کرسی خالی ہوئی تو وزیر تعلیم
زیدلٹز نے کینٹ کو یہ عزت دینی چاہی' اس یونیورسٹی کی عظمت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ وہاں
استادوں کا لقب کاونسلر ہوا کرتا تھا، اور اس جگہہ کی تنخواہ ۸۰۰ اشرفی سالانہ بھی جو اس زمانہ کو

[1] اسی طرح ہمارے محترم علامہ سر اقبال بھی برگسان کی شاگردی پر فخر کیا کرتے ہیں۔ ۱۲ مولف

مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت بڑی تنخواہ کہی جاسکتی ہے، یعنی ایک ہزار روپیہ ماہانہ لیکن کینٹ بندۂ زر نہ تھا وہ [illegible]
اپنے اصول کا پابند تھا، یعنی ذوق کے اس مصرع پر عمل کرتا تھا ع کون جائے ذوق، پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر
اسکے ایک دوست نے خط میں لکھا کہ تم نے بڑی غلطی کی جو ایسی اسامی کو قبول نہ کیا' اس پر کینٹ نے اسے لکھا [illegible]
میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں، تبدیلی کا لفظ میرے سکونِ دماغی کو برباد کرنے کیلئے کافی ہے، میں تبدیلی [illegible]
گھبراتا ہوں، خواہ اسکی بنا پر مجھے کتنی ہی فارغ البالی کیوں نہ نصیب ہو"

سنہ ۱۷۸۱ء میں کینٹ نے اپنی "کریٹیک آف پیور ریزن" یعنی تنقید عقل خالص شائع کی یہ وہ
کتاب ہے جس نے کینٹ کو حیات جاوید بخشی ہے' اسی کتاب کے سامنے ارسطو اور افلاطوں کے کارنامے ماند
ہوگئے۔ اور دنیائے عقل میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوگیا۔

سنہ ۱۷۸۱ء سے سنہ ۱۷۹۰ء تک کینٹ شبانہ روز تالیف و تصنیف میں مشغول رہا، گویا اس عرصہ میں دنیا و
ما فیہا سے قطعاً بے خبر رہا، سنہ ۱۷۹۰ء کے بعد سے اسکی صحت خراب رہنے لگی، ایک تو بڑھاپا دوسرے دن رات دماغی [illegible]
آخر صحت بیچاری کہاں تک نہ جواب دیتی، میں تو یہی کہوں گا کہ کینٹ خوش قسمت انسان تھا جو سنہ ۱۷۹۰ء یعنی ۶۶
سال کی عمر تک تندرست اور دماغی محنت کرنے کے لائق رہا، بہت سے بدنصیب ایسے بھی پڑے ہوئے ہیں جو ۳۰-۴۰
سال کی عمر ہی میں اس فلسفہ اور مطالعہ کی بدولت صحت جیسی نادر اور بیبہا دولت کو ہاتھ سے کھو چکے ہیں اور
اب نئی فلسفہ کی لائبریری پر حسرت سے نگاہ ڈالتے ہیں اور کلیجہ مسوس کر رہجاتے ہیں - ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(باقی)

شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی

(ولادت سنہ [illegible]ھ - وفات سنہ ۱۲۰۳ھ)

اُن کا

کلیات اور تذکرہ حیات

از

مولوی سید حسن صاحب، مدرس عربی بی ایس ٹی اسکول عظیم آباد پٹنہ،

زبان اُردو کی قابلِ قدر خدمات کے لحاظ سے عظیم آباد کیلئے[1] بارہویں صدی ایک بے مثال تاریخی اہمیت رکھتی ہے' اس
[illegible] کے شاندار کارناموں سے واقفیت رکھنے والے، علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کے اس دعویٰ سے کامل اتفاق کرینگے
"عظیم آباد ہندوستان کے ان عظیم الشان شہروں میں ہے جس کی مردم خیزی پر ہمارے ادبیات کو ناز ہے"
چونکہ اس عہد کا سب سے بڑا علمی و ادبی کارنامہ شعر گوئی اور سخن طرازی تھا اسلئے اس موقع پر ہمیں مختلف علوم
و فنون کی جستجو نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ شعر و سخن کے اس بازار کی رونق و سرگرمی کاملینِ فن کی نگاہوں
میں کہاں تک قابلِ اعتبار ہے؟ اس باب میں شعرائے اُردو کے قدیم و جدید مستند تذکروں کا مطالعہ اس فیصلہ پر پہونچاتا
ہے کہ ملک کے تمام اہلِ نظر اور اربابِ ذوق شعرائے عظیم آباد کی خوش گوئی اور خوش مذاقی کے ہمیشہ معترف رہے
[illegible] عظیم آباد کو یہ تاریخی فضیلت بھی حاصل ہے کہ میر کے بعد اردو کا سب سے پہلا تذکرہ اسی خاک کے ایک فرزند نے تذکرہ
[illegible] کے نام سے لکھا، جو اب اخلاف کی بے اعتنائیوں سے ناپید ہے، اسکے علاوہ شعرا کے متعدد تذکرے

[1] مقدمہ دیوان شاد عظیم آبادی،

یہاں لکھے گئے، جن میں تذکرہ جوشش، تذکرہ شورش اور گلزارِ ابراہیم کو خاص شہرت حاصل ہے، اول الذکر دو تذکرے
بھی نایاب ہیں، مگر تیسرا بانکی پور کے مشہور کتب خانہ مشرقیہ میں موجود ہے، اس کو مشہور فرانسیسی مورخ تاسی نے تمام
تذکروں سے زیادہ پسند کیا تھا، اسلئے کہ شعرا کے معتدبہ حالات جس قدر اسمیں ملتے ہیں ان کا وجود اور کہیں نہیں،
پھر سر جان گلگرسٹ کی فرمایشوں سے میرزا علی لطف نے اسی گلزارِ ابراہیم کو گلشنِ ہند کے نام زبان ریختہ میں اردو
تذکرہ شعرا کے بعد خود شعرا کا ذکر خیر بھی ضرور ہے، دہلی مرحوم کے چمن نوبہار میں جب خزاں کے جھونکے چلنے لگے
نونہالانِ چمن نکہتِ گل کی طرح آوارہ گرد اور غریب الدیار ہو گئے، اور جس کو جہاں پناہ ملی وہیں کا ہو رہا، اس گروہ
میں بھی سب سے زیادہ تعداد انھیں خوش گو شعرا کی ہے، جنھوں نے دلی سے نکل کر عظیم آباد کا رخ کیا، اور پھر یہیں
دہلوی شعرا کے علاوہ اس عہد میں خود یہاں کی خاک سے اتنے نغز گو شعرا اٹھے ہیں جن کے ذکر کے لئے
ایک طویل دفتر چاہئے، انمیں سے اکثر اساتذۂ دہلی سے مستفید ہوئے، اور بہتیرے وہ ہیں جو کسی کے آگے زانوے
ادب تہ کئے بغیر خود اپنی خوش گوئی اور خوش فکری سے مسلم الثبوت ہوئے۔ ان دنوں گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا
تھا، گلی کوچہ سے شعرا اور نثار اٹھتے تھے، اور جدہر دیکھئے ریختہ گوئی کا بازار گرم تھا، پھر دہلوی شعرا کی آمد نے
اس عظمت و رونق کے آسمان میں اور بھی چار چاند لگا دئے، جن میں اشرف علی خاں فغاں، میر ضیاء الدین ضیا،
استاد میر حسن، الم اور حزیں وغیرہ ایک حیثیتِ امتیاز رکھتے ہیں، اور بیدل، ایمن، جوشش، عشق[1]،
شورش، فدوی[1]، راسخ، اس خاک کے ایسے نغز گو شعرا ہیں، جن کی بدولت گیارہویں صدی کے ربع
آخر سے تیرہویں صدی کے ربع اول تک دلی کے سوا ہندوستان کا کوئی شہر عظیم آباد کا حریف نہ ہو سکا،

(۲)

افسوس ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اسلاف کے یہ کارنامے آج گردِ فنا میں روپوش ہیں، اور جو کچھ باقی

[1] عشق اور فدوی ہیں تو دہلوی مگر انکی شاعری کا وطن عظیم آباد ہے، اسلئے جہاں تک شعر و سخن کا تعلق ہے انھیں عظیم آبادی کہنا بیجا نہیں

ہیں ان کا وجود ڈوبنے والے ستاروں سے زیادہ نہیں ہے اسلئے ہمیں فخر و ناز کا اس وقت تک کوئی حق نہیں پہونچتا۔ جب تک
ہم انھیں اپنی سعی و تلاش، کوشش و کاوش سے دوبارہ منظرِ عام پر نہ لا سکیں، اسی جاذبہ کی کشش اور خیال کے نشو و نما
نے مجھے کلیاتِ عشق سے ملایا، یہ کلیات بھی مدتوں سے اور اساتذہ کے کلام کی طرح نایاب تھا، اصحابِ ذوق جستجو
و تلاش کی ناکامیوں سے پاشکستہ ہو چکے تھے، مولانا حسرت موہانی بھی اسی جستجو و تلاش کی امیدیں لیکر عظیم آباد
آئے، مگر افسوس کہ انکی بھی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی، یہاں تک کہ ہمارے صوبہ کے مشہور شاعر و مورخ حضرت
شاد بھی تاریخ بہار میں لکھ گئے ہیں "ان کے چند اشعار ہمارے بزرگوں کی زبان پر تھے"، اور خود ان کے ذخیرۂ معلومات
میں ایک مطلع سے زیادہ نہ تھا، جسے انھوں نے حیاتِ فریاد میں درج بھی کر دیا ہے۔
مجھے اپنی قسمتوں پر ناز ہے کہ اپنی گمنامی و نادانی کے باوجود عشق کا کلیات حاصل کر لیا، اور اب اس
کا انتخاب یادگارِ عشق کے نام سے شائع کر رہا ہوں، اس ناچیز تالیف کے ۳ باب ہیں "حالاتِ زندگی" "خصوصیاتِ شاعری"
اور "انتخاب کلام"۔

(۳)

عشق کا کلام چند در چند خوبیوں اور اچھوتوں کے اعتبار سے ہماری توجہ خاص کا مستحق ہے، جس پر مختلف
عنوانات سے کتاب میں تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے، یہاں اجمال کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے، عشق کو تاریخی اہمیت و
امتیازات تو یہ حاصل ہے کہ وہ مرزا سودا اور میر ضیا کے معاصر ہیں، اور میر تقی میر سے پچیس سال متقدم، اس امر کا لحاظ
بھی ضرور ہے کہ شاعر کا وطن تو دلی ہو، شاعری کا عظیم آباد، پھر ان کی آغوشِ تربیت میں عظیم آباد کے چند
نامور اور خوشگو شعرا کا پل کر جوان ہونا بھی ان کے کمالِ استادی کی دلیل ہے، ان تاریخی اہمیتوں کے ساتھ ساتھ اگر
علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے جب بھی موجودہ معیارِ ادب سے شاید ہی کچھ اتر نا پڑے، زبان میں سادگی
و سلاست تو ایسی ہے، کہ قدما میں ان کا کوئی حریف نہیں، پھر مفہوم کی دلآویزی و دلکشی، طرزِ ادا میں تاثیر و ترنم،
جذبات و خیالات کی پاکیزگی و لطافت کلیات سے اکثر و بیشتر جگہ نمایاں اور لبریز ہے۔

میں نے ابتدا میں شاہ صاحب موصوف اور ان کی شاعری پر ایک مختصر مضمون لکھا، اور چند اشعار بھی منتخب کئے تھے، لیکن جیسے جیسے کلام کا مطالعہ بڑھتا گیا، خوبیوں اور کششوں کے دروازے کھلتے نظر آئے، یہاں تک کہ میں نے اس چمنستان معنی کی روش روش اور پھول پھول سے مشام جان کو معطر کیا، اور اب جو ارباب معنی اور اصحاب ذوق کیلئے ایک گلدستہ زیبا تیار ہو گیا ہے، ذوق وخلوص کے ساتھ پیش کرتے ہوئے یہ ضرور کہوں گا کہ مندرجہ بالا تاریخی، علمی، اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ادبیات کے کسی طالب کو بھولے سے بھی کلام عشق کی اہمیتوں سے انکار نہیں ہو سکتا، بلکہ مطالعہ کے وقت ایک بصیرت افروز اور دل آویز مضمون ہوگا،

(۴)

شاہ صاحب موصوف کے حالات زندگی کا مطالعہ بھی اصحاب معنی کیلئے خاص طور پر کیف آور اور سبق آموز ہے، آپ حضرت شاہ محمد فرہاد ابو العلائی دہلوی کے نواسے ہیں، جنھوں نے جہانگیر جیسے بادشاہ وقت کی اپنی محویت و استغراق کے باعث تعظیم نہ کی، اور نہ جہانگیر نے اس کا کوئی برا اثر لیا، ان کی وفات کے بعد یہ در یتیم بازار ہندوستان ... ہوا، خواجہ محمدی خاں اسکے سب سے پہلے خریدار ہوئے، جو نواب عالیجاہ قاسم علی خاں ناظم بنگالہ کے رسالہ دار تھے، ان کے علاوہ صاحب گلشن ہند کی زبان میں "آنکھوں میں امرایان مرشد آباد کے احترام خاص رکھتے تھے" اور ذاتی ... جو فطری تھا، سب سے پہلے یہیں نغمہ ریز ہوا، کچھ دنوں کے بعد یکایک طبیعت کا رنگ بدلا اور مزاج فقر و درویشی کی طرف آ گیا، عظیم آباد پہونچے اور یہیں کے ہو رہے، یہاں مخدوم منعم پاک کے فیضان صحبت نے زندگی ہی میں انقلاب عظیم پیدا کیا، اور اب مرزا رکن الدین میرزا نہ رہے، شاہ صاحب ہو گئے، جو ان کے آبائے کرام کا وظیفۂ خاص تھا، اپنا سجادہ الگ بچھاتے ہیں اور ارشاد وہدایت، ریاضت ومجاہدہ کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا بازار گرم ہوتا ہے، ہر گھڑی اہل نظر اور ارباب ذوق کا مجمع پیش نظر ہے، جیسے اعیان شہر بھی ہیں، اور بارہویں صدی جیسا فن کے حق میں سازگار زمانہ بھی ہے، غرض شاعری نے درویشی کو اور درویشی نے شاعری کو جگمگا دیا، گویا مصحفی نے شاہ ... کو ... کہ تذکرہ میں عشق ہی کے لئے لکھا تھا۔

"شاعری و درویشی دوش بدوش می رود"

(۵)

میں نے کتاب کے مفید و دلچسپ بنانے کیلئے، صحت حالات اور اضافہ معلومات میں حتی الامکان اپنی ناچیز بساط کے مطابق کسی کوشش وکاوش اور جستجو وتلاش سے دریغ نہیں کیا، لیکن اس سے زیادہ دقتیں اور صعوبتیں ان گتھیوں کے سلجھانے میں ہوئیں جنھیں موجودہ صدی کے بعض ارباب قلم قلت مواد کے باعث الجھا گئے تھے، مثلاً ایک بزرگ نے لکھا، عشق، راسخ کے شاگردوں میں ہیں، حالانکہ خود راسخ کو عشق کے ایک شاگرد مرزا فدوی سے شرف تلمذ حاصل تھا، زندگی کے بعض حالات، اور مدت عمر کی تعیین میں اختلاف روایات کی انتہا نہ تھی جسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ... تالیف حقیر بہت جلد شرف خدمت حاصل کرے گی، لیکن مقام شکر ہے کہ میری محنتیں رائگاں نہ گئیں، اور امور ... کا تصفیہ بغیر تاویل کے محض تحقیق وتفتیش سے ہو گیا، جسکی تکمیل وتوضیح کیلئے مجھے خود حضرت عشق کے ... معاصر مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی طرف رجوع کرنا پڑا، اس سلسلہ میں ۳۰ انوار خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری میں ... پٹنہ، پھلواری اور فتوحہ کے اکثر کتب خانوں کی سیر ہوئی، انکے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں سے مواد حاصل ہوا، ... کتاب میں بھی جا بجا ان کے حوالے درج ہیں:-

نام کتاب	مصنف	قلمی یا مطبوعہ	کہاں موجود ہے
سرو آزاد	میر غلام علی آزاد بلگرامی	قلمی	کتبخانہ مشرقیہ عظیم آباد
گلزار ابراہیم	نواب علی ابراہیم خاں خلیل متوطن عظیم آباد	"	"
کیفیت العارفین	حضرت شاہ عطا حسین	"	کتبخانہ شاہ حسن الدین احمد صاحب گیا
بیاض قدیمی	قاضی محمد اسمٰعیل صاحب قدیمی	"	قاضی عبد الودود صاحب (پٹنہ)
کلیات بیدل	مرزا بیدل	"	کتبخانہ مشرقیہ "
تذکرہ شعرائے ہندی	مصحفی	"	"

شمار	نام کتاب	مصنف	قلمی یا مطبوعہ	کہاں موجود ہے
۷	کلیات یحییٰ	شاہ محمد یحییٰ صاحب	قلمی	خانقاہ سید محمد حامد صاحب (پھلواری)
۸	قرون ماضیہ	مولٰنا حکیم محمد شعیب صاحب	〃	کتبخانہ مجیبیہ (پھلواری)
۹	شعر العجم	علامہ شبلی نعمانی مرحوم	مطبوعہ	
۱۰	شعر الہند	مولانا عبد السلام ندوی	〃	
۱۱	تاریخِ بہار	خانبہادر سید علی محمد صاحب شاد مرحوم	〃	
۱۲-۱۳	کلامِ شاد - حیاتِ فریاد	〃	〃	
۱۴	کاشف الحقائق	شمس العلما حضرت امداد امام صاحب اثرؔ	〃	
۱۵	جلوۂ خضر	حضرت صفیر بلگرامی	〃	
۱۶	کلیات طپاں	مخدوم شاہ نور الحق طپاںؔ	قلمی	کتبخانہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی
۱۷	تذکرۃ الصالحین	مختار محمد حبیب اللہ صاحب	〃	〃
۱۸	کلیات مراثی طپاں	مخدوم نور الحق طپاںؔ	〃	〃
۱۹	کلیاتِ راسخ	شیخ غلام علی راسخؔ	مطبوعہ	
۲۰	رسالہ معارف پھلواری	مدیر - مولٰنا حکیم شاہ شعیب صاحب	〃	
۲۱	نکات الشعرا	میر تقی میرؔ	〃	
۲۲	گلِ رعنا	مولانا سید عبد الحئی صاحب ناظم ندوہ	〃	
۲۳	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسنؔ	〃	
۲۴	آبِ حیات	شمس العلما محمد حسین آزاد	〃	
۲۵	تذکرہ سراپا سخن	نساخؔ	〃	

شمار	نام کتاب	مصنف	مطبوعہ یا قلمی	کہاں موجود ہے
[illegible]	گلشنِ ہند	مرزا علی لطف	مطبوعہ	
[illegible]	گلشنِ بیخار	نواب مصطفےٰ خان شیفتہ	〃	
[illegible]	تذکرۂ حزین			
[illegible]	حجۃ العارفین	حضرت سید شاہ عطا حسینؒ	قلمی	کتبخانہ خانقاہ سید شاہ حسین الدین احمد صاحب (گیا)
[illegible]	ذکر الانساب	شاہ ولایت علیؒ (اسلام پور)	مطبوعہ	
[illegible]	نشترِ عشق	علی قلیخان ندیمؔ	قلمی	کتبخانہ مشرقیہ عظیم آباد
[illegible]	مجموعۂ کلام	شعرائے پھلواری		کتبخانہ مجیبیہ پھلواری
[illegible]	تکیۂ عشق کی بیاضیں	خواجہ شاہ ابو البرکات سجادہ نشین تکیۂ عشق وغیرہ		کتبخانہ تکیۂ عشق پٹنہ
[illegible]	انتخاب کلام میر	مولوی عبد الحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو دکن)	مطبوعہ	
[illegible]	تاریخ الکرام فی ذکر خلفائے عرب و اسلام	مولانا ۔ داناپور	〃	

(۶)

اس تذکرہ میں صرف شاہ صاحب موصوف کے ذکر پر اکتفا نہیں کی گئی، بلکہ اس زمانہ کی علمی و ادبی محفلوں
[...]وں سے لطف اندوز ہونے کیلئے مختلف نظارے مختلف عنوانات سے پیش کئے گئے ہیں، صوفیانہ شاعری
[...]یم آباد - عظیم آباد کی اہمیتیں خدمت زبان کے لحاظ سے، کلامِ عشق میں فارسی خیالات، عشق اور اردو کے
[...]را اساتذہ، میر و عشق کا مشاعرہ، اس کی خاص فصلیں ہیں، ان کے علاوہ بہتیری نئی معلومات کا اضافہ
[...]کیا گیا ہے، پھر اسی سلسلہ میں مرشد آباد، عظیم آباد اور بزرگان پھلواری، جہاں جہاں حضرت عشق کے
[...] شاعری کا نشو و نما ہوا، وہاں کے خوش گو شعرا کے حالات و کلام، غرض ایک سال کی مسلسل کوششوں اور
[...]شوں سے اس سلسلہ کے جتنے بھولے بسرے شعرا اور انکے پھیلے اور بکھرے پھول مل سکے، اس گلدستہ میں اپنی
[...] بساط اور سلیقہ کے مطابق سجا دیا ہے، تفصیل مزید کا یہ موقع نہیں، عشق کے چند اشعار سنئے اور

اور لطفِ کلام کا اندازہ فرمائیے ، یہ بات ہر جگہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ اشعار اس عہد میں کہے گئے ہیں جب اردو اپنے گہوارۂ
طفولیت میں بے باکی اور سادہ لوحی سے کھیل رہی تھی، اور یہ انھیں شفیق مربیوں کی آغوشِ تربیت کا فیضان تھا، جو
آج پل کر جوان ہوئی ہے، حضرت عشق کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہوں سوختہ دل فکر کوئی تازہ نہیں ہے
اک مصرع برجستہ مری آہ حزیں ہے

آہِ جاں سوز کو سردفترِ دیوان کیا
عشق نے دیکھتے ہو پہلے ہی طوفان کیا

اسکے چہرے پر خدا ہی جانے کیسا نور تھا
ورنہ یہ دیوانگی کیا عشق کا دستور تھا

داغ دل کا تو کبھی ہم سے مٹایا نہ گیا
یہ دیا وہ ہے جو دن کو بھی بجھایا نہ گیا

یہ ہر دم طبلہ سا پھوٹتا ہے
کہاں تک شیشۂ دل کو بناؤں

سُنا ہے کہ وہ آج آنے کو ہے
خدا جانے سچ ہے کہ افواہ ہے

کچھ یاد بھی ہے کہاں ہوا گم
کس سے پوچھیں سراغ دل کا

مہربانی کرو تو عیب نہیں
کام تو اب پیام سے گذرا

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے سئے ہے
یہ عاشق جاں باختہ کس دن کے لئے ہے

کیا پوچھتے ہو مجھسے کہ کیوں تونے رو دیا
دل نے کیا تھا جمع سو آنکھوں نے کھو دیا

دفترِ زندگی تمام ہوا
رہ گیا عشق کا سبق باقی

فلسفۂ انبساط

"انتخاب از کتاب رس"

از

جناب پنڈت مولوی حبیب الرحمان صاحب سنسکرت لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈہ

"جناب پنڈت مولوی صاحب موصوف ہمارے پرانے دوست ہیں، وہ عربی زبان کے عالم ہونے کے ساتھ سنسکرت کے بڑے فاضل پنڈت ہیں، اور سنسکرت علوم اور فلسفہ پر ان کی گہری نظر ہے، موصوف نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے علم و فن کے اس پرانے ذخیرہ سے اس ملک کے ناآشناؤں کو بھی آشنا کریں، چنانچہ سنسکرت کے ایک خاص علم کو جو کسی دوسری قدیم زبان میں موجود نہیں اور جو قدرتی اور فطری ہے، اس کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں، اور اس کا نام "فلسفۂ انبساط" رکھا ہے جو سنسکرت نام "رس" کا گویا ترجمہ ہے،

مسلم یونیورسٹی کے مختلف پروفیسروں اور استادوں کی نسبت ہمکو معلوم ہے کہ وہ تالیف و تصنیف اور تصحیح و تحشیہ کا کام بھی کرتے رہتے ہیں اور اسکو وہ علٰحدہ علٰحدہ شایع بھی کرتے ہیں، پروفیسر کاظم نے "زین الاخبار" شایع کی۔ پروفیسر حبیب کی انجمن تاریخ نے امیر خسرو کی خزائن الفتوح چھاپی۔ پروفیسر ڈاکٹر ظفر الحسن کی فلسفیانہ انگریزی کی کتاب کا ترجمہ ہونے والا ہے۔ مولوی محمد فاروق صاحب قانون مسعودی کی تصحیح کر رہے ہیں، پنڈت حبیب الرحمان صاحب رس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ سب کوششیں غیر منتظم اور ایک دوسرے سے

بالکل الگ ہیں، کیا اچھا ہو اگر دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح "مسلم یونیورسٹی پبلکیشنز" کا ایک سلسلہ ہماری یونیورسٹی میں قائم ہو اور یہ سب موتی اسی ایک لڑی میں منسلک ہو جائیں تو یونیورسٹی کی قدر و منزلت کے علاوہ خود علم و فن کی یہ قدردانی ہو گی اور غریب پروفیسروں اور استادوں کو جو علمی ذوق کی بیماری کے سبب سے گوناگوں خطرات میں مبتلا رہتے ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔ مگر ضرورت ہے کہ علمی ذوق کی تکمیل کے علاوہ "جلب زر" اور "حصول انعام" کا جذبہ اس خالص و مقدس کام کا "محرک" اور "مہیج" نہ ہو۔ تاکہ علمی رس کا پورا لطف اور نشۂ انبساط کی پوری لذت حاصل ہو سکے۔

"معارف"

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ نفس ناطقۂ انسانی جسم و جسمانیت سے پاک ہونے کے باوجود اس مادی میں ادراکات مادی پر فریفتہ، لذات حسی کا شیدائی اور مسرت محدود کا دیوانہ ہو رہا ہے، اس سے بھی عجیب یہ کہ عالم حواس کی سیروں میں ایسا مشغول ہوا کہ اپنی اور اپنے جذبات کی حقیقت کو بھی بھول گیا، وہ نہیں جانتا کہ انسان کا دل جذبات کا سمندر ہے، جس میں پے در پے لطیف موجیں اٹھتی رہتی ہیں، انھیں لہروں میں تمنائیں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتی ہیں، جب یہ بلبلے لہروں سے کھیلتے اور وجدان صحیح سے ٹکراتے ہوئے ساحل امید ہم آغوش ہو جاتے ہیں تو ان میں ایک لطیف کیفیت اور ایک دلفریب رنگینی پیدا ہو جاتی ہے جو کہ حسیات باطنی کی جان ہے، اور یہی سرور خاص مقصود و منتہائے جذبات ہے۔

سنسکرت کے ماہرین علم النفس اس سرور مخصوص اور کیفیت لطیف کو "رس" کہتے ہیں

رس بننے سے پہلے انسانی جذبات کو مختلف ارتقائی مدارج سے گذرنا ہوتا ہے، ان کیفیات اور واردات کا احساس ہر ذی روح کو ہوتا ہے، لیکن ایسی متجسس ہستیاں کم گذری ہیں جنھوں نے ان غیر مرئی اور لطیف محسوسات کو علمی روشنی میں لانے کا ارادہ کیا ہو۔

بہار آتی ہے، پھول کھلتے ہیں، باغ کا گوشہ گوشہ خوشبو سے معنبر و معطر ہو جاتا ہے۔ اہل دل ان پھولوں کے نظاروں، شمیم روح پرور کے جھونکوں، اور بلبلوں کے نغموں سے ایک وجدانی سرور حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان کیفیات لطیفہ کی تفصیل لفظوں میں نہیں کر سکتے۔

سنسکرت کے ماہرین علم النفس کا خیال ہے کہ انسان کے دل میں قدرت نے نو مستقل جذبات ودیعت کیے ہیں۔ محبت، خندہ دلی، افسوس، غصہ، حوصلہ یا امنگ، خوف، کراہت، تعجب، سکون۔

شاعری اور ناٹک میں بھی جذبات اپنے اسباب و آثار کی وساطت سے جب ارتقائی مدارج طے کر کے دائرۂ وجدان میں پہونچتے ہیں تو ایک غیر محدود انبساط اور لذت کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اسی کا نام "رس" ہے، اس کے ساتھ ہی ماہرین مذکور نے ان اسباب و آثار کی تقسیم و تعیین بھی کی ہے، جن کی مدد سے جذبات مذکورہ ارتقائی مدارج سے گذرتے ہیں اور ان کا اصطلاحی نام علی الترتیب محرک، اثر اور منقلب بتایا ہے، چنانچہ "کاویہ پرکاش" نامی کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں جذبات کی علت معلول اور معاون ہوتی ہیں وہ جب شاعری اور ناٹک میں پیش کی جاتی ہیں تو ان کو محرک، اثر اور منقلب کہتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ عملی زندگی میں تو یہ چیزیں جذبات کو عملی طور پر پیدا کرتی ہیں، اسلئے علت معلول اور معاون کہلاتی ہیں، مگر ناٹک کے تماشے اور شاعری میں ان کا صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کے پوشیدہ جذبات میں ایک ایسی جنبش وجدانی پیدا کر دیں کہ ناظرین ان سے مسرور ہو کر محو تماشا ہو جائیں۔ اس وجہ سے علت و معلول کو چھوڑ کر ان کو ناٹک اور شاعری میں اصطلاحاً محرک، اثر اور منقلب کہتے ہیں۔

محرک (علت جذبات) ان اسباب کو کہتے ہیں جو کسی جذبہ کو حرکت دیتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ اساسی اور مہیج۔

محرک اساسی وہ چیز ہے جو کسی جذبہ میں جنبش وجدانی پیدا کرے اور

محرکِ مہیج، وہ اسباب ہیں جو اس جذباتی کیفیت کی تائید و اضافہ کریں اور اس کے واسطے مناسب اور خاطر خواہ ماحول بن جائیں۔

پھر اس ہیجانی کیفیت سے جو جسم میں بے اختیاری قلب میں ارتعاش، اور نگاہِ شوق میں حیرانی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو اثراتِ جذبہ سے تعبیر کرتے ہیں اور جب یہ اثرات سمندر کی لہروں کی مانند پے در پے مختلف اشکال میں ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں تو انھیں **منقلباتِ جذبہ** (جذباتِ عارضی) کہتے ہیں۔

مثلاً گھٹا چھائی ہے۔ بہار کا جوش ہے۔ ذرّہ ذرّہ سے بہار کی رنگینیاں ٹپکی پڑتی ہیں، اور ایک مغنیہ بزمِ سرود میں بجلیاں گرا رہی ہے۔ اس وقت مغنیہ کا حسن و جمال کسی اہلِ دل محوِ نظارہ کے قلب میں محبت پیدا کر دیتا ہے اور سامانِ بہار کی تائید سے باقتضائے فطرتِ انسانی یہ جذبۂ محبت ابھر کر اُبھرتا ہے پھر وہ (محوِ نظارہ) جذبۂ محبت سے بیخود ہو کر ان حالات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جن سے اس کے واردات قلبیہ کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً بے اختیاری میں ایسے الفاظ اسکی زبان سے نکلتے ہیں جن سے اثراتِ جذبۂ محبت مترشح ہوتے ہیں، اس کے بعد تیسرے درجہ میں پہونچکر اس کیفیت میں اور تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس پر پے در پے مایوسی۔ امید۔ جنون۔ شکستہ دلی وغیرہ وغیرہ کا عالم طاری ہوتا رہتا ہے۔

مثالِ بالا میں محبت جذبۂ مستقل ہے، اس کا محرکِ اساسی مغنیہ و حسینہ اور محرکِ مہیج سامانِ بہار۔ اور اشکباری و سراسیمگی (وارداتِ قلبیہ کو ظاہر کرنے والی کیفیات) اثراتِ جذبہ ہیں اور مایوسی۔ امید۔ جنون وغیرہ منقلبات یعنی جذباتِ عارضی ہیں۔

ناٹک اور شاعری میں انھیں تینوں کا سین کھینچنے سے بالآخر جذبۂ مستقل میں ایک غیر محدود لذت، ایک وجدانی لطافت اور ایک پاکیزہ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت وہی جذبۂ مستقل "رس" کہلاتا ہے۔ اس طرح مذکورۂ بالا جذباتِ مستقلہ مدارجِ ارتقائی سے گذر کر علی الترتیب۔ عشق، ہنسی، رحم۔ غضب۔ بہادری۔ دہشت۔ نفرت۔ حیرت اور سکون کا رس کہلاتے ہیں۔ جنکو سنسکرت میں بہ ترتیب "شرنگار رس"۔ "ہاس رس"۔ "کرُن رس"۔ "رودر رس"۔ "ویر رس"۔ "بھیانک رس"۔ "ویبھتس رس"۔ "اودھت رس" "شانت رس" کہتے ہیں۔ غرض نو جذباتِ مستقلہ کی بنا پر رس کی بھی نو قسمیں ہوئیں۔

ناٹک کے تماشائی اور شاعری کا مطالعہ کرنے والے رس کے انوکھے اور ذوق آفریں ادراک سے مسرور ہوتے ہیں۔ رس کیا چیز ہے؟ اس حقیقت کو واضح کرنے کیلئے متقدمین متوجہ ہوئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ کسی حقیقی نقطۂ خیال پر متحد ہو جاتے، ان میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا اور گو ہر فریق حقیقت مذکورہ کی توضیح کیلئے اپنی تائید میں بھرت منی کا یہ قول پیش کرتا ہے۔ کہ "محرک، اثر اور منقلبات کے ملنے سے رس حاصل ہوتا ہے" مگر استدلال ہر فریق کا جدا گانہ ہے۔ چنانچہ کسی نے ہیرو (جس کا ڈراما کھیلا جا رہا ہے) اور ایکٹر کی باہمی مشابہت کی وجہ سے ہیرو کی حرکات و سکنات کے ساتھ اس کے قلب میں موجود اسکی محبوبہ کی محبت کو بھی ایکٹر میں کھینچ کر اسے رس ٹھہرایا، کسی نے محض نمایشی اور فرضی ہیرو (ایکٹر) کے بناوٹی جذبات اور حرکات سے اصلی ہیرو کے جذبہ کا قیاس کرایا، اور اس قیاسی جذبہ کو رس قرار دیدیا۔ کسی نے قلبی نورانیت اور سکون سے اس گتھی کو سلجھانے کی سعی کی۔ کسی نے فطرتِ انسانی میں پوشیدہ جذبہ کو محرک اور اس کے معاونین کی مدد سے رس بنانے کی بلا دلیل کوشش کی۔ زیادہ تنگ نظروں نے تو محرک اور معاونین ہی کو رس خیال کر لیا۔

غرض یہ کہ میمانسا شاستر والوں نے مشابہت کے جال میں رس کو پھانسنا چاہا۔ منطقیین نے اسکے نتیجے صغریٰ۔ کبریٰ کی شاہراہ پر قیاسی گھوڑے دوڑائے، سانکھی فلاسفی والوں نے اسکی تلاش میں نورانیت قلبی کے چراغ جلائے۔ اہلِ بلاغت و معانی نے منطقی الجھنوں سے تنگ آ کر جذبہ لطیف و معنوی کے زینے لگائے اور ان کے ذریعہ سے منزلِ مقصود تک پہونچنے میں سعی بلیغ سے کام لیا، دیگر حضرات نے بھی اس تجسّس میں اپنے اپنے قوائے فکریہ کو جنبش دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر رس کی وہ حقیقت واقعی

آج تک بے نقاب نہ ہوسکی جس کی طرف وید و اپنشد کے اقوال اشارہ کر رہے ہیں جیسا کہ رس کی حقیقت
کے واضح کرنیوالے مذاہب ذیل کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

پہلا باب

مذاہب

(۱) بھرت منی ناٹیہ شاستر کے ماہرین بھٹ لولٹ وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ محرک اساسی کے ذریعہ سے جذبۂ محبت پیدا ہوتا ہے اور سامانِ بہار۔ چاندنی، سیر باغ و دیگر اشتعال انگیز چیزوں سے ہیجان میں آتا ہے پھر اثرات کی مختلف کیفیات
و حالات سے اس کا انکشاف ہوتا ہے۔ اسکے بعد منقلبات یعنی جذبات عارضی کے اثر سے عاشق کا دل
ان واردات قلبیہ کا جولانگاہ بن جاتا ہے جو کمالِ محبت کی دلیل ہیں۔ اس مذہب کے قائلین کا خیال ہے کہ حقیقی
تو جذبۂ محبت رام وغیرہ یعنی ان ہیروز میں ہوتا ہے جن کا ڈراما کیا جاتا ہے۔ مگر ایکٹر میں بھی تماشائی اس کا
اعتبار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کو رام بنا کر پیش کرتا ہے اور رام ہی کے اوصاف خصوصی ظاہر کرتا ہے ایسی حالت
میں وہی اعتباری جذبۂ محبت تماشائیوں کے وجدان میں واضح ہو کر رس کہلاتا ہے۔

اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے کسی نے رسی کو دیکھا اور اسے سانپ یقین کر لیا اور اس یقینی مغالطہ
نے دیکھنے والے کے دلمیں ایسا خوف اور اس کے وہ تمام لوازم پیدا کر دئے جو واقعی سانپ کے نظارہ کا
اور اکی خصوصیات ہوتے ہیں ایسی ٹھیک اسی طرح تماشائیوں کا رام سمجھکر ایکٹر کو دیکھنا اسمیں سیتا کی محبت اور اس
کے لوازم کا اعتبار کرا دیتا ہے۔ غرض رس ایک فرضی اعتبار ہے جو یقین کی صورت اور لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) نیائے شاستر (منطق) کے ماہرین فاضل شری شنکگ اور ان کے مویدین کا مذہب یہ مذہب کسی قدر پہلے مذہب کے خلاف ہے اس کا دعویٰ ہے کہ رس ایک اعتبار فعل صحیح ہوتا ہے مثلاً رام کا ڈراما کرنیوالے

ایکٹر پر تماشائی کا پہلا اعتبار صحیح تو یہ ہوتا ہے کہ یہ رام ہی ہے یا یہی رام ہے۔ دوسرا اعتبار غلط یہ رام نہیں ہے
تیسرا اعتبار مشکوک یہ رام ہے یا نہیں۔ چوتھا اعتبار مماثل و مشابہ یہ رام کے مانند ہے۔ اب ان چاروں

اعتباروں کے بعد ان سب سے انوکھا ایک اعتبار پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ تماشائی ایکٹر کو سمجھتے ہیں کہ یہ
یقیناً رام ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کوئی گھوڑے کے فوٹو کو دیکھکر اس پر گھوڑے کا خیال قایم کرے۔
لیکن اس حالت سے تماشائیوں کا ادراک پھر ترقی کرتا ہے اور وہ اس وقت جبکہ ایکٹر مناسب حرکات و سکنات
کے ساتھ اپنی استادی کامل سے حسب ذیل جذبات رام کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ یہ سین دکھاتا ہے اور
اپنے جذبات کو پیشکش ناظرین کرتا ہے (ایک سنسکرت نظم کا ترجمہ) وہ سیتا جس کی آتشِ جدائی میں جلتے اور جس کو
یاد کرتے اتنی مدت گذر گئی اور جو میرے تمام اعضا میں آبِ حیات کی بارش ہے نیز جو اچھی طرح گھل مل جانیوالی
کافور کی سلائی کی طرح میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے اور جو میری جان کی مالکہ اور تمام تمناؤں کا سرمایہ ہے۔ وہی
(سیتا) آج میرے خیال سے منتقل ہو کر میرے سامنے مجسم ہو کر آگئی۔ (مگر کہاں) آہ آج تو گردشِ روزگار سے
اس شوخ چنچل اور بڑی بڑی آنکھوں والی پیاری سے میں جدا ہوں۔ آہ بدقسمتی سے اسکی جدائی ہی میں فوراً
برسکال (وقت یا موت) بھی آگیا جسمیں آسمان پر گھنے اور ہر طرف متحرک بادل چھا رہے ہیں۔ یعنی ایکٹر جب
اس طرح ان جذبات اور محرک، اثر اور منقلبات کا استادی کے ساتھ سین کھینچ دیتا ہے تو باوجود نقلی ہونے
کے بھی تماشائی ان جذبات اور محرک وغیرہ پر نقل کا گمان نہیں کرتے۔ اور ان ہی جذبات مذکورہ کے ذریعہ
ایکٹر میں جذبۂ محبت قیاس کر لیتے ہیں اور کمالِ دلکشی کے باعث گہری تمنا کے ساتھ بار بار اس جذبۂ قیاسی کی
بڑھ کر وجد و لذت حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہی جذبۂ لذت آفریں تماشائی پر متجلی و واضح ہو کر رس بنجاتا ہے۔

اسکو منطقی قیاس کے مطابق یوں سمجھنا چاہیے کہ اس رام (ایکٹر) میں سیتا کی محبت ہے کیونکہ اسمیں سیتا
کی محبت سے علاقہ رکھنے والے جذبات موجود ہیں اور جس شخص میں جسکی محبت سے تعلق رکھنے والے جذبات

(بقیہ نوٹ صفحہ سابق) پہلے جملہ میں لفظ یہ کے ساتھ رام کی عینیت (رامیت) کی بے تعلقی کی نفی کرکے یہ کے مشار الیہ
(ایکٹر) کو رام کا عین قرار دیا گیا ہے اور دوسرے میں یہ کے علاوہ موصوفین سے صفتِ عینیت
مذکورہ کی نفی کی گئی ہے،

پلئے جاتے ہیں اسمیں اسکی محبت کا ہونا لازمی ہے۔ پس اس ایکٹر میں سیتا کی محبت ہے اور سیتا کی محبت اصل میں تھی تو یہ رام ہی ہوا اور اسی کے جذبات دکھا رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح کُہر درحقیقت دھواں نہیں، صرف دُھویں کے مشابہ ہے لیکن پھر بھی دھواں کی طرح بعض اوقات آگ کا دھوکہ دیتی ہے کیونکہ دھویں کیلئے آگ کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح حقیقی و واقعی جذبات نہونے پر بھی نقلی جذبات سے ان کے لازم یعنی جذبۂ محبت کا قیاس ہوتا ہے اور جذبہ کی کمالِ دلکشی کے سبب تماشائی اس سے بار بار لذت وجدانی حاصل کرنے کیلئے ہوئے ادراک میں محو ہو جاتے ہیں، اس حالت میں جذبۂ محبت اس میں ہوتا ہے۔

(باقی)

کلیاتِ شبلی اردو

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جسمیں مثنوی صبح امید، قصاید جو مختلف جلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، تاریخی، سیاسی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی کے متعلق کہی گئی تھیں، یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کے چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ

ضخامت ۱۲۰ صفحے قیمت عہ

سفرنامہ روم و مصر و شام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلیؒ نے جو سفر کیا تھا اس کے حالات، واقعات، یہ سفرنامہ بہت مقبول ہو چکا ہے۔ اب معارف پریس نے اسکو پھر سے نہایت اہتمام اور توجہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔

ضخامت ۲۴۲ صفحے قیمت عہ

"مینجر"

پھلواری شریف میں علم حدیث

از

مولانا شاہ محمد عزالدین صاحب ندوی پھلواروی

معارف کے گذشتہ نمبروں میں "ہندوستان میں علم حدیث" کے عنوان سے ایک مضمون شروع کیا گیا ہے جو اپنی وسعت معلومات کے لحاظ سے قابلِ صد ستایش ہے، صوبہ بہار میں علم حدیث کے سلسلہ میں پھلواری شریف کے سلاسلِ حدیث کا بھی ایک مختصر تذکرہ آگیا ہے، جو اپنی جگہہ پر ایک حد تک تفصیل طلب ہے، اس لحاظ سے میں نے مناسب جانا کہ اہل علم حضرات کے سامنے پھلواری شریف کے سلاسلِ حدیث کی پوری وضاحت کردوں، اور یہ بتا دوں کہ پھلواری شریف میں معقول و منقول دونوں نے دوش بدوش پرورش پائی اور کسی دور میں بھی خالص معقولات کا زور شور نہ رہا کیونکہ مضمون میں بعض ایسی باتیں بھی ضبط تحریر ہوگئی ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔

"عزالدین"

پھلواری شریف صوبہ بہار میں ضلع پٹنہ کا ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے، جو اپنی گوناگوں عظمتوں کے باعث اگر اس کو صوبہ کا علمی و عملی دماغ کہے جانے کا مستحق ہے، اس سرزمین میں مختلف دور میں مختلف باعظمت ہستیاں پیدا ہوئیں اور اپنے علم و عمل کے چشمے سے صوبہ اور نہ فقط صوبہ بلکہ بیرون صوبہ کو بھی فیضیاب کرتی رہیں، اس سرزمین میں سب سے پہلی باعظمت شخصیت حضرت سید منہاج الدین راستی کی ہے، جو ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، اور حضرت مخدوم بہاری رحمہ کے خلفا میں ہیں، حضرت مخدوم بہاری رحمہ نے آپ کو اپنے طریقۂ عرفانی کا مجاز کل بنایا تھا جس میں سلسلۂ حدیث کی اجازت بھی تھی، ان کے بعد حضرت مخدوم جنید ثانی، حضرت برہان الدین (لال میاں) اور حضرت خواجہ عماد الدین قلندر کی شخصیتیں ہیں، اور ان تمام بزرگوں

معارف میں جو کچھ لکھا گیا وہ حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے زبانی بیان کے مطابق تھا۔

کو عرفانی دولت کے ساتھ سلاسلِ حدیث کی دولت بھی میسر آئی تھی، اس لحاظ سے پھلواری شریف میں علم حدیث یا
معارف کی زبان میں "سلسلۂ حق"[1] کا اجرا بہت قدیم ہے -

لیکن سب سے زیادہ واضح اور کتبِ حدیث کی تفصیل کیساتھ جو سلسلہ پہونچا وہ مولانا یٰسین گجراتی کا سلسلہ
ہے جو مولانا عتیق بہاری کو پہونچا اور مولانا عتیق نے اپنے زمانہ کے مشہور صوفی محدث شیخ نور الحق سے شیخ عبد الحق
کا سلسلہ بھی لیکر ان دونوں کی سندیں اپنے شاگرد شیخ محمد وجیہہ بن شیخ امان اللہ جعفری کو تفویض کیں اور ان کے
ذریعہ دیگر اکابر پھلواری کو پہونچیں، لیکن اسکے علاوہ اور بھی بہت سی سندیں ہیں جو مختلف حضرات کو مختلف
وقتوں میں حاصل ہوتی رہیں،

یوں تو پھلواری شریف اپنی خصوصیات میں تقریباً تین صدی سے مایہ ناز رہی لیکن پھلواری کا سب سے زیادہ
کمال ایک یکتائے روزگار آفتابِ عرفان و طریقت حضرت تاج العارفین مولانا شاہ مجیب اللہ قلندر قادری المتوفی
۱۰۹۸ھ کی ذات سے وابستہ ہے، آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم پھلواری ہی میں اپنے پیر حضرت خواجہ عماد الدین قلندر
قادری سے حاصل کی اور پھر بغرض تحصیل بنارس تشریف لیگئے، اور وہاں حضرت رسول نما مولانا شاہ وارث بنارسی
سے ابتداءً علوم ظاہری کی تحصیل فرمائی اور پھر انھیں علوم ظاہری نے ان کے باطنی کمالات بھی آپ پر ظاہر کردیے
اس شہسوارِ مرکب علم و عرفان نے دونوں ہی چشموں سے سیرابی حاصل کی، لیکن ظاہری و باطنی تعلیم کے بعد جب
رسمی بیعت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا تمھارا حصہ ہمارے یہاں نہیں، تم ظاہری بیعت محبوب رب العالمین خواجہ
عماد الدین قلندر سے کرو، چنانچہ حسب فرمان آپ وطن تشریف لائے اور خواجہ عماد الدین قلندر سے شرف بیعت
و ملازمت حاصل کی -

اس مختصر سی تمہید سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری نے ان دونوں
بزرگوں سے عرفان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ معقول و منقول کی بھی تحصیل کی تھی، ان دونوں بزرگوں

[1] معارف: "سلسلۂ حق" سے مقصود معارف کے مردِ مضمون میں علم حدیث نہیں بلکہ مولانا عبد الحق محدث دہلوی کا سلسلہ ہے -

نے فقر و عرفان کی اجازت کیساتھ حدیث کے سلاسل کی بھی سند دی تھی کیونکہ خواجہ عماد الدین قلندر نے ظاہری و باطنی
تکمیل کا زمانہ دہلی، لاہور اور سادہور میں گذارا، اور دہلی میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے پوتے شیخ الاسلام
سے حدیث کی اجازت لی اور پھر اسے اپنے روحانی فرزند مجاز مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری کو تفویض فرمایا، اس طرح
حضرت مولانا وارث رسول نما بنارسی نے بھی اپنی ظاہری تکمیل اپنے دور کے اکابر اہل علم سے کی تھی اور حدیث کی اجازت
مشہور محدث شیخ محمد حیات سندھی سے حاصل کی تھی، آپ نے بھی اسکی اجازت تاج العارفین مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری
کو تفویض فرمائی، اس لحاظ سے تاج العارفین مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری عرفانی دولت کے ساتھ حدیث کے ان دو
عظیم مرکزوں کی بخشی ہوئی دولت سے بھی سرفراز تھے"

پھلواری شریف میں ایک اور بزرگ مولانا محمد مخدوم صاحب قادری تھے جنھیں بھی مولانا وارث رسول نما
سے شرف ملازمت حاصل تھا، مولانا رسول نما بنارسی نے محدث حیات سندھی والی یہ اجازت حضرت محمد مخدوم صاحب کو
مرحمت فرمائی تھی، اور حضرت مخدوم نے اپنی اجازتِ سلسلہ کیساتھ لوگوں کو سلسلۂ حدیث کی بھی اجازت دی،
حضرت مخدوم اور حضرت تاج العارفین مولانا شاہ مجیب اللہ کے ذریعہ یہ سند خاندان میں منتقل ہوتی رہی، اسی درمیان
تاج العارفین کے پوتے مولانا شاہ محمد قاسم مجیبی سفرِ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے اور وہاں کے مشہور محدث شیخ
... بن لبطاح الاعدل سے صحاح و سنن کی اجازت لی؛ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ محدث مذکور نے اپنے پورے
... کی اجازت انھیں مرحمت فرمائی، جس کی عبارت یہ تھی کہ "مجھے معقول و منقول کا جو علم اساتذۂ وقت سے ملا ہے
... ان سب کی اجازت تمھیں مرحمت کی" یہ بزرگ غالباً وہی ہیں جن سے مولانا حیدر فرنگی محلی نے صحیحین و دیگر کتب
حدیث کی سند حاصل کی ہے، اور پھر مولانا قاسم علیہ الرحمہ نے اپنے صاحبزادہ مولوی شاہ وصی احمد صاحب علیہ الرحمہ
کو اس کی اجازت دی، اور اس ذریعہ سے تاج العارفین حضرت شاہ محمد مجیب اللہ قادری کے خاندان میں ایک
... سندِ حدیث کی اجازت کا اضافہ ہوا،

ابھی ان سلاسلِ حدیث کی برکتوں سے تاج العارفین کا خاندان متمتع ہو رہا تھا کہ حضرت تاج العارفین کے

دوسرے پروتے حضرت مولانا شاہ ظہور الحق قادری قلندر قدس سرہ جو درحقیقت پھلواری کی تاریخ اور حضرت
شاہ مجیب اللہ قادری کے خاندان کے انمول موتی تھے، اور جن کی ذات پر خاندان مجیبی جس عہد تک بھی فخر کرے بجا ہے
انھوں نے اپنی خداداد قابلیت کی مدد سے درسی کتابیں بہت جلد تمام کیں، پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے
سندِ حدیث حاصل کی، اور نہ فقط رسمًا حاصل کی بلکہ اس کا درس دیا، صحیحین اور حصن حصین جیسی ضخیم جلدیں حفظ
کر ڈالیں، اور غالبًا پھلواری کی تاریخ میں مولانا شاہ ظہور الحق پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ صحیحین کو
حفظ کیا، اور حدیث و متعلقاتِ حدیث پر متعدد رسالے لکھے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے حدیث کے فن کو از سر
نو زندہ کیا، اور اسکی ترویج دی اور یوں تو نہ فقط حدیث بلکہ تقریبًا تمام فنون کے وہ جامع تھے اور ادب و انشا
کے تو بادشاہ تھے،

اسی دور میں مولانا کی صف کے ایک اور معصر عالم اپنی جامعیتِ عمل کے لحاظ سے بہتر سے بہتر انگلوں کے بھی ...
بہتر حضرت مولانا شاہ عبدالغنی ابوالعلائی منعمی قدس سرہ ہیں، آپنے بھی ابتدائی تعلیم اپنے بزرگوں کے آغوش میں
پائی، اور پھر پٹنہ عظیم آباد کے ایک بڑے عالم سے تکمیل کی اور حدیث کی سند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے
حاصل کی، اور پھلواری شریف کی سب سے قدیم اور تاریخی مسجد "سنگی مسجد" میں ساٹھ سال مسلسل درس و تدریس کا سلسلہ
جاری رکھا، اور ساٹھ سال مسلسل موجیں لیتے رہنے کے بعد دریائے علم و عمل خشک ہو گیا - انا للہ، اور دنیا کے عام ...
کی طرح زمانہ نے یہ امانت بھی ہم سے چھین لی، مولانا شاہ عبدالغنی ابوالعلائی قدس سرہ کا فیض اتنا عام ہوا کہ ...
مخصوص افراد کے پھلواری کی خاک کا ہر کرہ آپکے علمی و روحانی فیض سے متمتع ہوا، اور حضرت شاہ ولی اللہ
محدث کا فیض پھلواری کے در و دیوار میں نمایاں ہوا، مولانا شاہ عبدالغنی قادری قدس سرہ نے حضرت مولانا شاہ
وحید الحق منعمی ابوالعلائی کو اپنا سلسلۂ فقر عطا فرمایا اور اسکے ساتھ اپنی درس تدریس کی وراثت عطا کی ...
شریف میں حدیث کا یہ چرچا اور اسکی سندوں کا اس طرح پر دیا جانا، اور پھر اس کا تعلیم و تعلم یہ سب حضرت مولانا آل احمد
قادری قدس سرہ کے عرب تشریف لیجانے اور وہاں سے مالامال واپس آنے سے پہلے کا ہے، اسمیں شک نہیں کہ

... مولانا آل احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آخری دور میں اگلی تخم ریزیوں کی ایسی آبیاری کی کہ اس مقدس شجر کی جڑیں
... انتہائی ثبات کو پہونچ گئیں، اور پھر یہ درخت عظیم الشان تنے اور شاخوں کی صورت میں ہمارے سامنے نمودار
ہوا، حضرت مولانا آل احمد رحمۃ اللہ علیہ کے عرب سے وطن واپس تشریف لانے کے بعد تقریبًا پھلواری کے اکثر اہلِ علم
حضرات نے سبقًا حدیث کی کتابیں پڑھیں، اور سندیں لیں، جن میں حضرت مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر قادری
قدس سرہ صاحب سجادہ خانقاہ مجیبی و حضرت مولانا شاہ محمد نعمت مجیب فریدی مجیبی و حضرت مولانا شاہ محمد
... نعمت اللہ فریدی مجیبی و حضرت مولانا شاہ محمد اشرف مجیب فریدی مجیبی رحمہم اللہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر
ہیں، حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر قادری قدس سرہ نے اپنی خلوت خاص میں حضرت مولانا آل احمد رحمۃ اللہ
علیہ سے اس فن شریف کی تحصیل شروع کی تھی، اور مذکورہ بالا حضرات ان کے ہم سبق و رفیق درس تھے، ان
کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات نے ان سے سندیں لی تھیں اور ان حضرات کی تحصیل کے بعد محدث ممدوح نے سب کو
... اسندیں عطا کی تھیں، جو ان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہیں، حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر قادری
قدس سرہ کی مہارتِ فن اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ تمام معاصرین ان کی حدیث دانی کے قائل تھے، اور اکثر
... استفاضہ بھی کرتے تھے، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری پھلواری تشریف لائے تو حضرت نصر نے آپ
... کو اپنا مہمان خاص بنایا، اور اس فن شریف سے متعلق مباحث پر گفتگوئیں کیں، مولانا احمد علی محدث رحمہ اللہ
... جب وطن واپس تشریف لیجانے لگے تو فرمایا میں سمجھتا تھا کہ صوبہ بہار میں مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی ہی اس فن کے
... جامع بزرگ ہیں، لیکن جناب شاہ صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ آپ بھی اس فن کے اعلم ترین لوگوں
... میں ہیں، اور حضرت مولانا آل احمدؒ کے دور کے بعد اس موجودہ دور سے پہلے بھی پھلواری کے اکثر اہلِ علم نے عرب جا کر نیز ہندوستان
... کے اکابر سے سندیں حاصل کی تھیں جنمیں حضرت قبلہ مولانا قاری شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی مدظلہ اور فریدِ عصر علامہ علی نعمت مجیبی
... حضرت مولانا شاہ محمد بدر الدین قادریؒ و حضرت مولانا شاہ محمد عین الحق مجیبیؒ صاحب سجادہ اور خاندان مجیبی کا ایک اہم ترین
... فرزند حضرت مولانا شاہ محمد حسن میاں مرحوم قابلِ ذکر ہیں،

تلخیص و تبصرہ

موجودہ روس کی علمی مساعی مجالس

سنہ ۱۹۱۷ء کے بعد روس سے تمام بیرونی دنیا کو اسقدر الگ اور ناواقف رکھا گیا ہے اور اسکے متعلق ایسی دور از حقیقت عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کہ اکثروں کو حیرت بھی
ہوتی ہے اور نفرت بھی، لیکن جب کوئی جولان ہمت اس پردہ راز کو ذرا سا ہٹا کر اسکی اصلی شکل کی ایک ہلکی سی بھی جھلک د
دیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تمام نتائج ایک بڑی حد تک غلط تھے، بالشویک روس کے متعلق عام خیال یہ ہے
کہ وہ تمدن و تہذیب، علوم و فنون، مذہب و خیال، دولت و تجارت کا دشمن ہے لیکن وہاں کی علمی مجالس کی جو رو
ہم تک پہونچی ہے اور اس میں گذشتہ سال کی ترقیوں کا جو حال درج ہے وہ ان اوہام، خوفناک، سرخ روسی افسانوں کی
دوسری ہی شکل میں پیش کرتی ہے چنانچہ وہاں کی علمی اکیڈمی (Academy of Science) کے ناظم نے جو تقریر
سلسلہ میں کی اس سے اس مجلس کی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔ اسکی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

"ہم اپنی مجلس کے مختلف شعبوں کی کارروائیوں کو بیان کرنے سے پہلے اسکے کتب خانہ کے متعلق بتانا چاہتے ہیں
اسوقت مختلف شعبوں میں ۴۹۲۰۰۰ کتابیں ہیں لیکن ہماری تمام کتابوں کی مجموعی تعداد ۰۰۰۰۰ ۴۰ ہے۔ ابتداء
سال میں ہمارے پاس دس لاکھ ایسی کتابیں تھیں جنکو فن وار تقسیم نہیں کیا جا سکا تھا، صرف گذشتہ دو سال میں
لاکھ کتابوں کا اضافہ ہوا ہے، اسوقت کتب خانہ میں ۱۷۳۰۰ رسائل آتے ہیں، گذشتہ سال انکی تعداد صرف
تھی، اخبارات اسکے علاوہ ہیں۔"

مجلس تاریخ علوم نے اپنے شعبہ کے متعلق اس سال ایک عجائب خانہ بھی قائم کیا ہے، اور مشہور روسی سائنسدان
لومونوزوف کی تصانیف کی اشاعت کا بھی سامان کیا ہے، ہمارے یہاں کے مختلف شعبہ یہ ہیں:-

مجلس طبیعی ارضیات اس مجلس میں حالات ارضی مثلاً زلزلہ، کوہ آتش فشاں وغیرہ کی طرف خاص توجہ کی جاتی

اور کریمیا کے زلزلے کے سلسلہ میں تحقیقات جاری ہے، ترکستان سربین ریلوے لائن اور قازقستان کے دار السلطنت کی تبدیلی
کا مسئلہ بھی اس مجلس کے زیر غور ہے، زلزلہ کے متعلق گذشتہ سال ۱۲۰۰ اطلاعات موصول ہوئیں اور ۵۰ رپورٹیں شایع کی
گئیں، اسکے علاوہ طبیعیات اور ارضیات کے متعلق دو الگ مستقل مجالس بھی ہیں، موخر الذکر مجلس کا کام صرف ان قوتوں کا
دریافت کرنا ہے، جنکے ذریعہ زمین کی پیداوار میں ترقی ہو، سنہ ۱۹۲۷ء میں واشنگٹن میں اسی مجلس کی جو نشست ہوئی تھی
اس میں روس نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا، اور ۱۳ مضامین شایع کئے۔

مجلس حیاتیات یہ مجلس غیر مرئی حیاتی اجزاء و مخلوق کا مطالعہ کرتی ہے، لیکن آلات کا فقدان اس مجلس کے
کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتا رہتا ہے، مجلس نباتیات بھی درختوں اور پودوں کی زندگی و موت کے مطالعہ میں مشغول
ہے۔ ان مجلسوں کے علاوہ حیوانیات کے متعلق بھی ایک الگ مستقل مجلس ہے، اسکے ساتھ اسکے ماتحت شعبوں کی طرح اور بہتیرے
ہیں جنکی تفصیل طوالت کے خیال سے نظر انداز کیجاتی ہے۔

مجلس طبقات الارض نے اپنا ایک عجائب خانہ الگ قائم کیا ہے، اسمیں عہد حجریات و معدنیات سے لیکر
موجودہ عہد تک کی چیزیں ہیں وہ اس مجلس کی مختلف مہموں نے منگوالیا، اور یانخاں، جو گیریا وغیرہ سے بہترین اشیاء
حاصل کی ہیں، معدنیات کے سلسلہ میں دو نمایشیں بھی گذشتہ سال منعقد کی گئیں اسی طرح تمام اساتذہ فن کا ایک
جلسہ لینن گراڈ میں ہوا، اور اسمیں روس کی ۲۷ مرکزی علمی جماعتوں نے اپنے تقریباً ۲۰۰ نمایندے روانہ کئے اور
اسکے ساتھ ہی ایک بہت بڑا تجربہ خانہ بھی مختلف تجربات کیلئے قائم کیا، اسی مجلس نے تنگس کے شہاب ثاقب کی تحقیقات کیلئے
بھی ایک مہم مقرر کی، مجلس نباتیات نے روس کے یوروپین حصہ سے ہر قسم کے پھل اور پودے منگوائے ہیں اور اب
وہ ایک تمام روسی مملکت کی نباتاتی کانفرنس کرنے والی ہے، عجائب خانہ حیوانات میں تقریباً ۲ لاکھ اشیاء کا اضافہ ہوا ہے
اسکے متعلق جو مہمیں منگولیا، جزائر لیوکیو، کوہ ورخویانسک وغیرہ کو بھیجی گئی تھیں بہت سی عجیب و غریب چیزیں لانے
میں کامیاب ہوئی ہیں، اس مجلس نے اس سال ۹۶ مضامین اس موضوع پر شایع کئے اور عجائب خانہ کے مستقل کارکنوں
کے علاوہ اس وقت سو اساتذہ فن بیرون ملک میں مصروف تحقیقات ہیں، اس عجائب خانہ کو صرف ایک سال میں

۹۸۰۰۰ آدمیوں نے آکر دیکھا۔

مجلسِ نسلیات سائبریا میں اپنا کام کر رہی ہے، اور رسائل و کتابی حیثیت سے انکی مساعی بہت امید افزا ہیں، اس مجلس کا بھی اپنا ایک عجائب خانہ ہے، اسمیں ۴۰ مستند اساتذہ کام کرتے ہیں، اور گذشتہ سال ۳۰۰۰ آدمیوں نے اس کا معائنہ کیا۔

ایشیائی عجائب خانہ بھی اسی سلسلہ میں ایک اہم کام کر رہا ہے، یہ بڑے قسم کا عجائب خانہ ہے، اور اسی طرح مشرقی زبانوں کی تصانیف کے قلمی نسخوں سے مالا مال، ادبی و علمی خدمات و تحقیقات کیلئے عموماً موجود ہیں، اور اسی مجلس کے ماتحت ایران ریویو اور مجلہ علوم بدھ بھی شائع ہوتا ہے، بدھ تمدن اور ترکیات کے متعلق دو جدید شعبے اس سال قائم کئے گئے ہیں اور اس مجلس کی ابتدائی معلومات کی سب سے بڑی علمی و عملی جماعت بنانے کا خیال درپیش ہے، ان کے علاوہ جافتہ اور طفلس کی تاریخی و اثری تحقیقات کے لئے بھی دو جداگانہ مجلسیں قائم ہیں اور یہ مجلسیں ان جگہوں کے تمدن، زبان، تاریخ وغیرہ کے باہمی ارتباط کا مطالعہ کر رہی ہیں، اور انکو بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

ان علمی مجالس کی طرف سے جو مختلف مہمیں گذشتہ سال مختلف مقامات کو روانہ کی گئی ہیں، انکی تعداد ۶۵ ہے، یہ سب کی سب بڑے پیمانہ پر مرتب کی گئی تھیں، انمیں سے پندرہ نے یورپین روسی علاقہ میں کام کیا اور باقی پچاس دور دراز کے علاقوں میں مصروفِ عمل تھیں، انکے سامنے جو موضوع تھے وہ یہ ہیں۔ ارضیات۔ کیمیات ارضی، نباتات، طبقات، حیوانیات وغیرہ وغیرہ،

ان مہموں کے علاوہ قطب شمالی کے متعلق ایک خاص مجلس مقرر ہے جو اپنے مستقر سٹیاتنگن شہر سے وہاں کے حالات کا مطالعہ کرتی رہتی ہے۔

اب یہ مجلس روس کے علمی کام کرنے والوں کے ناموں و حالات کا ایک لغت شائع کرنے والی ہے، اور اس لغت میں ۱۳ ہزار علمی خادموں کے نام ہونگے، روس نے اپنی اندرونی علمی ترقی کے علاوہ بین الاقوامی علمی مجالس میں بھی پورا پورا حصہ لیا ہے۔

یہ اس قوم کی علمی کوشش کا حال ہے جسکے متعلق ہمکو باور کرایا جا رہا ہے کہ وہاں علم و تمدن کی جگہ جہل و بربریت کا راج ہے۔ "ن"

مسئلہ سندھ کا تاریخی پہلو

گذشتہ چند سال سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں سندھ کو ایک مستقل صوبہ بنا دینے کے متعلق ایک عام تحریک پیدا ہو گئی ہے، لیکن کتنے اصحاب ہیں جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ سندھ کا مسئلہ ابتدائے عہدِ حکومت برطانیہ سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ رہا ہے، ایشیاٹک ریویو کے گذشتہ نمبر میں پنجاب کے سابق لفٹنٹ گورنر سرلوئس ڈین نے اس کے تاریخی پہلو پر نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح سندھ کا سوال ہمیشہ سے حکومتِ ہند کے پیشِ نظر رہا ہے، وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

"سائمن کمیشن کے سلسلہ میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا سوال ایک مرتبہ پھر پیدا ہو گیا، اور اس وقت اس کے اسباب اختلافِ زبان و معاشرت بتائے جاتے ہیں، سندھ کا صوبہ بمبئی سے صرف اسلئے الحاق کر دیا گیا تھا کہ برطانوی فوج صرف اسی بندرگاہ سے وہاں پہونچ سکتی تھی، اور یہ صوبہ اس وقت شمالی برطانوی ہند، ریاستوں اور دوسری حکومتوں کے علاقہ کی وجہ سے الگ تھا، اسلئے جو فوجی کارروائی بھی کرنا ہوتی، وہ بمبئی سے ہوتی لیکن قدیم میں یہ صوبہ ہمیشہ سے پنجاب اور ملتان کا ضمنی صوبہ رہا ہے، مغلوں کے عہد میں یہی حال تھا، اس کے بعد یہ درانیوں کے قبضہ میں آیا، مہاراجہ رنجیت سنگھ اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہتے تھے، لیکن ۱۸۳۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور یہ آرزو انکے ساتھ ہی دفن ہو گئی، اسکے بعد انگریزی فوج براہ سندھ کابل گئی پھر ۱۸۴۳ء میں نیپیر (Napier) نے اسے برطانوی ہند میں شامل کر لیا۔ یہ تو سیاسی تاریخ ہوئی، اور اسی وجہ سے جو ریل کراچی سے اندرون ملک کو آتی تھی عرصہ تک سندھ، پنجاب، اور دہلی ریلوے کہلاتی تھی۔

یہ بات ناظرین کو معلوم ہی ہوگی کہ ۱۸۷۹ء میں لارڈ لٹن کی حکومت نے جنگ افغانستان کے اولین دور کے بعد ہی اس بات کی منظوری حاصل کر لی تھی کہ ماورائے دریائے سندھ کے علاقہ کو ایک سرحدی صوبہ بنا دیا جائے، اور سندھ یا کم از کم اس کے ایک حصہ کو سندھ سے ملا دیا جائے، تمام معاملہ طے ہو گیا تھا اور یہ اعلان سرکاری گزٹ میں

شایع ہونے کیلئے تیار ہوچکا تھا کہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں سر پی ایل ایس، کیونگری کے کابل میں قتل ہونے کی خبر موصول ہوئی اور یہ اسکیم ملتوی کر دیگئی، اسکے بعد ۱۸۸۰ء میں انگلستان میں اعتدال پسندوں کی حکومت ہوگئی اور لارڈ رپن کی دوسری تجاویز کی طرح یہ بھی منسوخ کر دیگئی۔

لیکن اسکے بعد بھی سندھ کو پنجاب سے ملحق کر دینے کا سوال برابر حکومت کے پیش نظر رہا، مگر کسی نہ کسی وجہ سے اسکی تکمیل موقوف رہی، پنجاب کی غربت اور یہ مسئلہ کہ وہاں اس وقت گورنر کی جگہ ایک لفٹنٹ گورنر حاکم ہے اور ہائی کورٹ کے بجائے ایک چیف کورٹ ہے، ایسی چیزیں تھیں جنکی بنا پر سندھ کے تاجروں نے اس الحاق سے سخت اختلاف ظاہر کیا، دوسری طرف سندھی حکام کو یہ خوف تھا کہ پنجابی حکام انکے بہترین اضلاع پر قابض ہو جائینگے۔ اور پنجابی حکام اپنی جگہہ پر پنجاب کے میدانوں کے رہتے ہوئے سندھ کے صحرا کے اضافہ پر تیار نہ تھے، ممکن تھا کہ ۱۹۰۱ء میں جب کہ لارڈ کرزن نے شمالی مغربی سرحدی صوبہ بنایا تھا، سندھ کا پنجاب سے الحاق ہو جاتا، لیکن لارڈ کرزن کو دوسرے کام کرنے تھے اور شاید وہ اس طرح پنجاب کی اہمیت کو بھی بڑھانا پسند نہیں کرتے تھے۔

"ن"

عرب کے مقدس شہر

یوں تو تقریباً ہم سو سال سے متعدد مسیحی یورپین اشخاص نے ذاتی یا سیاسی اغراض سے عرب کی مقدس سرزمین پر مسلمان بن کر قدم رکھا اور اپنے مقصد کی تکمیل کی ہے لیکن اس طرف جو لوگ گئے ہیں ان میں لارنس اور فلبی کے بعد سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت الڈن رٹر کی ہے، وہ ایک انگریز حاجی کی حیثیت سے اسوقت عرب میں داخل ہوا جب کہ سلطان ابن سعود اور امیر علی بن شریف حسین میں حجاز کے متعلق جنگ چھڑ چکی تھی اور امیر علی نے جدہ وغیرہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، وہاں مہینوں رہنے کے بعد واپسی پر اس نے عنوان بالا کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی ہے، ٹائمس نے اپنے ادبی ضمیمہ میں اسکی تنقید شایع کی ہے، تنقید نگار لکھتا ہے:-

"انگریز شاذ و نادر ہی مکہ (معظمہ) اور مدینہ (منورہ) جاتے ہیں اور جن حالات میں مسٹر ای رٹر نے اپنا سفر شروع کیا اس وقت ایک مغربی سیاح کی یہ جرات اپنے اندر خاص انفرادی اہمیت رکھتی ہے، وہ تقریباً ایک سال ان شہروں میں رہا اور اسنے وہاں جو کچھ معلومات حاصل کئے، اور ان کو جس بہتر طریقہ سے ترتیب دیا ہے، وہ اس کے لئے کافی ہیں کہ وہ ایک زائر کیلئے مکمل ہدایت نامہ ثابت ہوں، اس کا سفر مشکلات سے گھرا ہوا تھا، مصری حکومت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ محمل اور غلاف کعبہ کو روانہ نہ کرے، اسی وجہ سے اکثر مصری بھی اپنے کو اس فریضہ کی ادائیگی سے آزاد سمجھنے لگے تھے، دوسری طرف امیر علی نے جدہ کے بندرگاہ کو سلطان ابن سعود کے مقابلہ میں بند کر رکھا تھا، رٹر سواے ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار ہو کر الہم پہونچا، اور احرام باندھے راستہ کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا مکہ (معظمہ) پہونچا، یہاں اسنے اپنا نام احمد ظاہر کیا، اور ظاہر کیا کہ وہ ایک انگریز حاجی ہے، اور اسی مقدس ہستی کی حیثیت سے ابن سعود اور شیخ سنوسی سے ملا۔

ہمارا زائر مکہ معظمہ کے حالات کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے، وہاں کے موسمی حالات، وہاں کی شدت گرمی کے ساتھ ہی ساتھ وہ وہاں کے باشندوں کے حالات بھی قلمبند کرتا ہے، یہاں کے لوگ اپنے کو جیران اللہ کہتے ہیں اور ایام حج کی آمدنی کی امید پر کاشت وغیرہ سے بے نیاز، مطوف حاجیوں کی جماعتوں کو ارکان حج بتاتے ہیں، زیر تنقید سال حاجیوں کی تعداد بہت کم تھی، اس میں سب سے زیادہ ملایا کے تھے، انکے علاوہ کچھ حبشی بھی تھے، لیکن وہ اس قدر غریب تھے کہ خیرات پر ان کا گذارہ تھا۔

ہمارا مصنف دوسرے سیاحوں کے خلاف، اہل مکہ کے متعلق بہت اچھی رائے کا اظہار کرتا ہے، اس کا بیان ہے کہ یہاں کے لوگ بہت بلند اخلاق ہوتے ہیں اور یہ کہ شریف حسین کا عہد حکومت بہت اچھا تھا اور صرف پروپیگنڈا کرنے والوں نے اسکو بدنام کر رکھا ہے، وہابیوں کے عہد سے زیادہ آسودگی و فراوانی تھی، مغربی ناظرین کیلئے یہ حقیقت عجیب معلوم ہوگی کہ اسلام کے ان مرکزی شہروں میں سلطان عبدالحمید ثانی کا عہد حکومت عہد زریں سمجھا جاتا ہے، اور انھوں نے موجودہ وہابی حکومت کو اسی طرح قبول کیا ہے، جس طرح انگلستان نے جنگجو ولیم کو، مسکین معتقدین کو، متعدد حیثیتوں سے وہابیوں کی مذہبی خشکی اہل مکہ کیلئے بہت گران ہے، یہ

کرٹ موصد اس بات کے بھی روادار نہیں ہیں کہ کوئی شخص مکہ مکرمہ میں "یارسول اللہ" کہہ کر بھی پکارے، اور ان کا خیال ہے کہ مدینہ منورہ میں روضۂ اطہر کی موجودگی لوگوں کی نماز میں ضرور کچھ نہ کچھ انتشار پیدا کردیتی ہوگی، اسلئے وہ زیارت مدینہ کے سلسلہ کو ختم کردینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، کیا یہ بھی پروپگنڈے کی صورت نہیں ہے؟ وہابی مسلمان بزرگوں کے مقبروں کو دیکھ کر ان پر ہنستے ہیں، اور انکو مسمار کردینے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں! وہ تمباکو کش اور نبیذ نوشی کی گونسوں سے تواضع کرتے ہیں لیکن اہل مکہ کی قہوہ نوشی جائز سمجھی جاتی ہے۔

سلطان ابن سعود نے اس قسم کی باتوں کے روکنے کے لئے جو کچھ کیا ہو، سنہ ۱۹۲۵ء میں مکہ میں غلام علانیہ فروخت ہوتے تھے: ایک لونڈی اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے ۳۰ پونڈ سے ۸۰ پونڈ تک ملجاتی تھی، اور غلام تو اتنے سستے تھے کہ عسیر میں، استلنگ میں بھی دستیاب ہوجاتے تھے، لیکن ان کے ساتھ ہی رٹر نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ عربوں کا غلاموں کے متعلق جو تخیل ہے وہ یورپ کے تخیل سے بالکل جداگانہ ہے؛"

"ن"

خلفاے راشدین

از مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی سابق رفیق دار المصنفین

سیر الصحابہ کے سلسلۂ مہاجرین کا پہلا حصہ اس نام سے شایع ہوا ہے، اسمیں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت فاروقؓ، حضرت عثمانؓ ذی النورین اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے حالات ذاتی، سوانح، اخلاق، و فضائل اور ان کی خلافت کے سیاسی، انتظامی، علمی، دینی کارنامے اور فتوحات ملکی بہ تفصیل لکھے گئے ہیں، جن کو پڑھکر خلافت راشدہ کی ۳۰ سالہ تاریخ پوری سامنے آجاتی ہے، اور ان خلفاے راشدین کے کمالات، فضائل، مناقب اور کارنامے پیش نظر ہوجاتے ہیں، ضخامت ۵۱۳ صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ اعلیٰ، قیمت ۳ؔ

"مینجر"

اخبارِ علمیہ

نقلی ریشم کی صنعت

تقریباً ربع صدی سے نقلی ریشم کی دریافت وصنعت، تجارتی دنیا میں ایک روز افزوں اہمیت حاصل کرتی جاتی ہے، متعدد ملک ہزاروں ٹن کا نقلی ریشم تیار کرتے ہیں، مندرجۂ ذیل اعداد اسکی دوازدہ سالہ ترقی کو ظاہر کرینگے:

ملک کا نام	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۲۵ء
امریکہ	٧٠٠ ٹن	٢٣٥٠٠ ٹن
اطالیہ	١٥٠ "	١٤٠٠٠ "
برطانیہ	٣٠٠٠ "	١٢٠٠٠ "
جرمنی	٣٥٠٠ "	١٢٠٠٠ "
فرانس	١٥٠٠ "	٨٠٠٠ "
بلجیم	١٣٠٠ "	٥٠٠٠ "
ندرلینڈ		٤٠٠٠ "
سویزرلینڈ	١٥٠ "	٢٥٠٠ "
دوسرے ممالک	٧٠٠ "	٤٥٠٠ "

اب اسی سلسلہ میں یہ دیکھئے کہ اسمیں سے کتنا مال ہندوستان آتا ہے اور سالانہ اس سے کتنی رقم باہر جاتی ہوگی؟

	سنہ ۲۳-۱۹۲۴ء	سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء
برطانیہ	۴،۲۸۷ ہزار پونڈ	۶،۴۵۸ ہزار پونڈ

	سنہ ۱۹۲۳-۲۴	سنہ ۱۹۲۶-۲۷
اطالیہ	۷٫۹ ہزار پونڈ	۳۸۴۳٫۲ ہزار پونڈ
جرمنی	۹٫۵ "	۲۳۳٫۱ "
نیدرلینڈ	۱۹٫۵ "	۳۵۸٫۳ "

انگلستان کا تعلیمی خرچ

انگلستان کی تمام آبادی کی تعداد ہندوستان کے ایک بڑے صوبہ کی تعداد سے زیادہ نہیں ہے لیکن اسکے ساتھ وہاں تعلیم کے سلسلہ میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ وہاں کی تعلیمی سرگرمی اور کوشش کا آئینہ ہے اور اسمیں کو ان کی حالت کا صحیح نقشہ نظر آتا ہے، گذشتہ سال اور اس سال کے اخراجات کی تفصیل اس بیان کو واضح ترکرتی ہے۔

نام مجالس	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۲۸ء
۱- مجلس تعلیم	۴۱۶۴۹۸۹۹ پونڈ	۴۱۲۱۵۸۲۸ پونڈ
۲- عجائب خانہ برطانیہ	۲۸۳۵۵۹ "	۲۸۰۸۵۷ "
۳- شاہی جنگی عجائب خانہ	۱۲۹۴۵ "	۱۳۰۳۹ "
۴- عجائب خانہ لندن	۴۹۶۲ "	۴۸۱۰ "
۵- قومی نگار خانہ	۳۴۶۲۵ "	۳۹۲۸۲ "
۶- قومی تصویر خانہ	۷۹۰۳ "	۸۱۵۳ "
۷- مجموعہ ولیس	۱۱۰۳۷ "	۱۱۱۳۶ "
۸- علمی تحقیقات وغیرہ	۲۲۸۲۷۸ "	۲۲۵۰۸۵ "
۹- ویلز کے کالج اور یونیورسٹیاں	۱۵۸۶۰۰۰ "	۱۵۷۹۴۰۰ "
۱۰- تعلیم عامہ متعلق اسکاٹ لینڈ	۶۱۷۳۴۸۵ "	۶۰۳۶۱۴ "
۱۱- نگار خانہ اسکاٹ لینڈ	۱۰۷۲۸ پونڈ	۱۰۴۳۸ پونڈ
۱۲- قومی کتب خانہ	۷۰۵ "	۴۷۵ "
میزان	۵۰۰۰۴۱۲۶ پونڈ	۴۹۴۹۲۴۴۹ پونڈ

گذشتہ سال سے اس سال ۵۱۱۶۷۷ پونڈ زائد منظور کئے گئے ہیں۔

"ٹی"

برطانوی ہند کے صنعتی جھگڑے

سرمایہ اور مزدوری میں جو عام کشمکش ہر جگہ جاری ہے اس سے ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور گذشتہ سال اس سلسلہ میں ہندوستان میں جو جھگڑے ہوئے ان کا مطالعہ ہندوستان کی ابتدائی صنعت کیلئے ایک بڑے نقصان کا پتہ دیتا ہے، چنانچہ گذشتہ سال ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء تک مختلف کارخانوں میں ۲۰۳ اسٹرائکیں ہوئیں اور ان میں ۵۰۶۸۵۱ مزدور شریک ہوئے، سنہ ۱۹۲۷ء میں صرف ۱۲۹ ایسے جھگڑے ہوئے اور ان میں ۱۳۱۶۵۵ مزدور شریک تھے، اس سلسلہ میں کام کے جو دن ناغہ ہوئے ان کی تعداد ۳۱۶۴۷۴۰۴ ہے اور گذشتہ پانچ سال کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے، اسکے مقابلہ میں سنہ ۱۹۲۷ء میں یہ تعداد صرف ۲۰۱۹۹۷۰ دن تھی۔

"آر"

دہات کے کپڑے

پارچہ بافی کے حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ اب اس بات کا کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے کہ مختلف دہاتوں کو ریشمی اور سوتی تاگے کی طرح بنا کر ان سے بہترین کپڑا تیار کیا جاسکتا ہے، تجربہ کیلئے سب سے پہلے المونیم کا انتخاب کیا گیا چنانچہ اطالیہ کی خواتین اسکے بنے ہوئے کپڑے استعمال کر رہی ہیں، اور لندن میں تو موسم گرما کی مجلس رقص کیلئے بہترین جوتا اسی المونیم کا بنا ہوا سمجھا جاتا ہے لیکن یہ جوتے دہات کے پتر کے نہیں ہوتے بلکہ انکے ریشمی نما تاروں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ "آر"

دق و سل ہندوستان میں

بدبخت ہندوستان میں یہ موذی مرض جس زبردست طریقہ سے مسلط ہو گیا ہے اس کا رونا فضول ہے سنہ ۱۹۲۶ء کے جو اعداد ہمارے سامنے ہیں، وہ بہت خوفناک ہیں، ہندوستان کے مریضوں کی تعداد ...... لاکھ ہے اور اسمیں ...... مریض صرف بنگال میں ہیں، اسی صوبہ میں ایک لاکھ آدمی اس سے سال بھر کے اندر مرے۔

"آر"

دنیا کا نادر ترین ٹکٹ

اس مہینہ ٹکٹوں کی بین الاقوامی مجلس کی نمائش لاہاورے میں ہوگی، اسمیں دنیا کا سب سے زیادہ نادر ٹکٹ بھی دکھایا جائیگا، یہ برطانوی گینیا کا ایک سینٹ کا ٹکٹ ہے، اور فروری سنہ ۱۸۵۶ء میں ٹکٹوں کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے مقامی طور پر عام ٹائپ میں چھاپ لیا گیا تھا، اب دنیا میں اس ٹکٹ کا کوئی دوسرا نمونہ موجود نہیں ہے، اسکی دریافت کا سہرا ایک طالب علم کے سر ہے، لیکن وہ اسکی اہمیت سے واقف نہ تھا اور اسنے اسے چند شلنگ میں بیچ ڈالا، اسکے بعد وہ ٹکٹوں کے سب سے بڑے شائق جیرن آر درلان فریری کے پاس چالیس سال تک رہا، اور جب فرانس کے حکم سے دشمن کے اسباب کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۲۲ء میں فروخت کیا گیا تو امریکہ کے مسٹر آرتھر ہنڈ نے اسے ۷۰۰۰ پونڈ میں خرید لیا، یہ ایک ٹکٹ کی بڑی سے بڑی قیمت ہے، جو ادا کی گئی ہے، لیکن ٹکٹوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا خیال ہے کہ اب اسکی قیمت کسی حالت میں بھی دس ہزار پونڈ سے کم نہیں ہے۔

"ٹی"

جراثیم کش آلہ

پیرس کے مشہور مستند ماہر عکس ریز ڈاکٹر ایف، ہالوک نے اس آلہ سے جس سے وہ عکس ریز کے ذریعہ مریضوں کا امتحان کرتے ہیں، جراثیم کو فنا کرنے کا کام لینا شروع کیا ہے، اور اس طرح اس کیڑے کو جس کی وجہ سے بدن میں آبلے پڑ جاتے ہیں، مارنے میں کامیاب ہوتے ہیں انکا بیان ہے کہ انکے آلہ کی قوت ایک ذرہ کا دس لاکھ گنا ہے۔

"سا" "ن"

ادبیات

جامِ صہبائی

از جناب اثر صہبائی بی اے

(۱)

نے بزمِ حیات کی ہے پروا مجھکو — نے ظلمتِ موت کا ہے کھٹکا مجھکو
ہر شام ہے خوابِ مرگ طاری مجھ پر — ہر صبح ہے اک حیاتِ تازہ مجھکو

(۲)

صہبا ہے نشاطِ روح معدوم نہیں — آگاہِ حیات ہیں جو مغموم نہیں
انجام کی فکر کیوں ہے ناداں تجھکو! — معلوم نہیں کسی کو معلوم نہیں!

(۳)

ہنگامۂ عیش و بت پرستی میں نہیں — رندی و سیہ کاری و مستی میں نہیں
معلوم نہیں، ہمیں کہاں ہے! کیا ہے!! — وجدانِ سرور بزمِ ہستی میں نہیں

(۴)

سرشارِ طرب نہیں ہے مقصود مرا — تختِ جم و کے نہیں ہے مقصود مرا
وہ دل کہ گداز دے خوشی سے غم کو — اس عرش کا مستوی ہے معبود مرا

جذباتِ اثرؔ

از

مولوی محمد یوسف صاحب اثرؔ ردولوی

جو ہم لک حقیقتِ عشق کی نظر آئی حسنِ مجاز میں
یہی برق وادیٔ طور تھی جو نہاں تھی پردۂ راز میں

سرِ شہ مانہ المعتباں نظر آیا نقشِ الوہیت
جو نہاں تھا سرِ عبودیت شکنِ جبینِ نیاز میں

سببِ سکونِ دل و جگر تھے ستم ہی آپ فتنہ گر
کہ ہزار گردشِ چرخ ہیں، تری چشمِ بندہ نواز میں

شبِ انتظار کا ماجرا سرِ بزم مجھ سے نہ پوچھیے
مرے انتشار کو دیکھئے ذرا اپنی زلفِ دراز میں

کبھی میں ہوں سرخوشِ کیفِ غم کبھی مستِ بادۂ انبساط
مری مستیوں کا یہ رنگ ہے کبھی سوز میں کبھی ساز میں

ستم کشاکشِ یاس سے مری آرزوئیں فنا ہوئیں
نہ وہ دل میں ذوقِ تپش رہا نہ وہ لطف سوزو گداز میں

تو کدورتوں سے بچا کے رکھ کہ ہے شرطِ حسنِ صفائے دل
ترے آئینہ میں ہو وہ ضیا جو جمالِ آئینہ ساز میں

نہ رکوع ہے نہ سجود ہے نہ قیام ہے نہ قعود ہے
یہ اصولِ ملتِ عشق ہو کہ فنا ہو اپنی نماز میں

جو یہ تیری جلوہ گری رہی، یہی میری بیخبری رہی
تو امیدِ دید بر آچکی تری جلوہ گاہِ نماز میں

تو عبث ہے ناصحِ مہرباں دلِ دردمند پہ معترض
نہیں اپنے بس میں یہ آئینہ کہ ہے دستِ آئینہ ساز میں

ہے اثرؔ قلمروِ عشق میں نہیں شرط بندہ و صاحبی
کہ جو حکمرانِ ایاز ہے وہ ہے قیدِ زلفِ ایاز میں

الکلام

علامہ شبلی کی مشہور تصنیف، جدید علم الکلام، جسمیں عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیا ہے اور ملاحدہ اور منکرین کا رد کیا ہے۔ طبع سوم مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۲۱۶ صفحے قیمت عہ۔

"مینجر"

باب التقریظ والانتقاد

عربوں کا تمدن

مصنفہ ڈاکٹر جوزیف ہیل مترجمہ جناب سید نذیر نیازی صاحب بی اے، (جامعہ) ضخامت ۲۸۹ صفحے قیمت عا۔ پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی،

از

مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

جرمن مستشرق ڈاکٹر جوزیف ہیل نے عربوں کے تمدن پر ایک کتاب لکھی ہے، جس کو پروفیسر صلاح الدین خدا بخش
[نے جرمن] زبان سے انگریزی زبان میں منتقل کیا، اور جناب سید نذیر نیازی صاحب بی، اے نے اس انگریزی ترجمہ سے اسکو
[اردو] کا جامہ پہنایا ہے، اور ترجمہ کے وقت بعض اہل علم کی مدد سے اصل جرمن نسخہ بھی پیش نظر رہا ہے، اور یہی نسخہ ہمارے
[پیش] نظر ہے، کتاب چھ حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے، "عرب قبل اسلام" "محمد صلعم" "فتوحات اسلامی" "بنو امیہ" "بغداد"
[اند]لس اور شمالی افریقہ" اور اس طرح اس میں، اسلام کی ظہور پذیری، ملکی فتوحات، اور اس کے عہد بعہد کی تمدنی
[ترقی]وں کا ایک دلچسپ خاکہ کھینچا گیا ہے،

لیکن کتاب کے مباحث اور اس کے اردو ترجمہ کی حیثیت کو پیش کرنے سے پہلے اس کی ایک خاص
[خص]وصیت کا تذکرہ کرنا ہے، اور وہ اصل کتاب پر مترجمین کے حواشی کا اضافہ ہے، پروفیسر صلاح الدین خدا بخش نے
[ان]گریزی ترجمہ میں جا بجا ایسے حواشی ثبت کئے ہیں، جن سے مختلف مقامات پر اصل کتاب کی توضیح، بعض مقامات
[پر مص]نف کی تاریخی غلطیوں پر تنبیہ اور کسی جگہ اس کے غلط نظریوں کی تردید کی گئی ہے، پھر نیازی صاحب نے اصل

کتاب اور انگریزی مترجم کے حواشی کو سامنے رکھکر مزید حواشی ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں منسلک کئے ہیں اور جہاں انھیں ضرورت محسوس ہوئی ہے، مصنف اور مترجم کی غلطیوں اور تاریخی تسامح پر اپنے حواشی میں تنبیہ کی ہے اسکے بعد اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"علاوہ ازیں اسمیں بڑی خوبی یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ بات کے جسے پروفیسر موصوف مستشرقین کے عام انداز میں لکھ گئے ہیں، ساری کتاب ان کی دقتِ نظر، اصابتِ رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے، جو ایک علمی تصنیف کی سب سے قیمتی خصوصیات ہیں"

اس طرح جناب نیازی نے مصنف کے ان تمام تاریخی بیانات، ان سے قائم کردہ نظریئے، اور پھر ان اخذ کئے ہوئے نتائج کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی، کیونکہ جو ایک آدھ بات مستشرقین کے عام انداز میں ہے ان کی تردید حواشی میں کردی گئی ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم جناب نیازی کے حسن ظن کا ساتھ نہ دے سکے، اور ہمیں ان کے حواشی میں مزید وسعت کی ضرورت محسوس ہوئی، اس لئے ہم کتاب کے مباحث کے ساتھ مصنف کے ایسے بیانات بھی پیش کرتے ہیں، جن پر جناب نیازی کے مزید حواشی کی شدید ضرورت ہے۔

کتاب کے پہلے باب "عرب قبل اسلام" میں جغرافیہ عرب، عرب کی قدیم مشہور حکومتوں معین اور لحیان اور قدیم قوموں اور قبائل کا اجمالی بیان اور ان کی تمدنی ترقیوں، قومی خصائل، اور مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے، عربوں کی ان مختلف حکومتوں کے زمانہ عروج و زوال کی تعیین، ارباب تاریخ و ماہرین کتبات کا بڑا موضوع رہا ہے، اور اس کے متعلق مختلف اہل علم کے مختلف نظریئے معروف ہیں، اس موقع پر اگر مصنف نے اپنے دیگر ہموطن، جرمن ماہرین آثار و کتبات کے نظریوں کو اختیار کیا ہے، تو کوئی حیرت انگیز امر نہیں، لیکن اس موقع پر مصنف کے اس نظریئے پر خاص توجہ کی ضرورت تھی، کہ عربوں میں "فقدان وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ احساس رکھنے سے" یہ نتیجہ کیونکر اخذ ہوتا ہے، کہ ان میں اطاعت و فرماں برداری کا مادہ نہ تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت بھی نہیں کرتے، پھر مصنف نے اپنے اسی نظریہ سے آگے چل کر یہ ثابت کیا ہے کہ "اسلام نے ان میں اسی وصف کو پیدا کرکے اپنی اشاعت کی، حالانکہ عربوں کا اپنے سرداروں کی اطاعت ایک نمایاں وصف کے طور پر مخصوص شیوہ سمجھا جاتا ہے، عہد جاہلیت کا وہ زمانہ جو اسلام سے قریب تر تھا، اس میں ان کے فقدانِ وحدت، اور ایک قوم ہونے کے نہ احساس ہونے سے اگر کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کے بجائے قبائل کے سرداروں کے ہاتھ میں تھے، اور اس وقت حکومت کی کوئی تشکیل نہیں تھی، ورنہ جہاں تک سرداروں کے اقتدار کا تعلق ہے وہ اپنے قبائل کے ایک ایک فرد پر مطلق العنان حاکم تھے، اور بچہ بچہ ان کی اطاعت پر تیار تھا،

اس لئے اگر داعی اسلام آنحضرت صلعم کے پیش نظر دعوتِ اسلام پیش کرتے وقت بقول مصنف کے کسی متحدہ حکومت کا خاکہ ہوتا تو آنحضرت صلعم غلاموں، لاوارثوں اور غربا میں دعوتِ اسلام پیش فرمانے کے بجائے سرداران عرب کو اتحاد باہمی کی دعوت دیکر کسی ایک نقطہ پر جمع فرماتے، اور نہایت آسانی سے متحدہ عربی حکومت کی بنا ڈال سکتے تھے، خصوصاً جبکہ خاندانِ عبد المطلب کو قبائلِ عرب پر ایک عام تفوق حاصل تھا، اور عبد المطلب واقعۂ فیل میں عرب کی رہنمائی کر چکے تھے،

کتاب کا دوسرا باب "محمد" (صلعم) ہے، جسمیں عہدِ رسالت کی اجمالی تاریخ مستشرقانہ تبصرہ کے ساتھ بیان کی گئی ہے، مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ عربوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط سے ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو دین حق کی جستجو میں سرگرداں تھا، آنحضرت صلعم اسی گروہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور آپ حالاتِ وقت کے مناسب ایک مذہب کی دعوت دیتے ہیں، عربوں میں "اطاعت و انضباط کی کمی تھی، آپ اپنی دور اندیشی سے اس کمی کو نماز باجماعت سے پورا کرتے ہیں جس سے امام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ مساوات انسانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، اور مکہ میں ایک مضبوط جماعت پیدا ہوتی ہے، اور یہی دینِ اسلام کا اساس ہوتی ہے، لیکن شرفاے مکہ اس تحریک کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے، آپ حج کے موقع سے فائدہ اٹھا کر یثرب (مدینہ) کی خانہ جنگیوں کو (نعوذ باللہ) بھانپتے ہیں، اور ایک داعی امن

کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ پہونچتے ہیں تو آپ اپنی کی زندگی میں ایک "نبی" تھے مدینہ آکر وہ امیر بن گئے اور پھر "سردارِ جماعت" کی حیثیت اختیار کرلی، پھر مہاجرین کو ان کے مصائب اور وطن کی یاد دلائی جاتی ہے، کعبہ کو ایک خاص عظمت دی جاتی ہے، پھر مدینہ کے مختلف قبائل و مذاہب میں ایک دوسرے سے جنگ کرا کر ان کے نفاق سے فائدہ اٹھا کر ایک ایک کا زور توڑ دیا جاتا ہے، اور پھر متحد ہو کر جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، یہاں تک کہ فتحِ مکہ کے بعد ایک عظیم الشان حکومت قائم ہو جاتی ہے،

انگریزی مترجم نے اس موقع پر گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے مختلف اقتباسات جابجا درج کئے ہیں جو مصنف کے بیانات سے مختلف ہیں، اور نیازی صاحب نے اپنے حاشیہ میں سلسلۂ غزوات کے وجوہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی سے اخذ کر کے پیش کر دیئے ہیں، اور پھر مصنف کے چند فقروں اور خیالات کو نقل کر کے اپنی ان سے بیزاری ظاہر کر دی ہے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھے،

لیکن اولاً تو جس قدر فقرے نقل کئے گئے ہیں، ان کے ماسوا اس باب میں جابجا زہر موجود ہے، اس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں، وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں، ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اس وقت تک قطعی بے سود ہے، جب تک کہ ہم نفسِ واقعات کی تصدیق یا تکذیب نہ کر لیں، جن سے وہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں، اس لئے نیازی صاحب کو صرف ان چند فقروں سے محض "اسلامی نقطۂ نظر" کی بنا پر بیزاری کرنا، ان کے پہلو کو اور کمزور کر دیتا ہے، ضرورت تو اس کی تھی کہ نفسِ ان واقعات کی صحت ترتیب وقوع، اور ان کے اسباب و علل پر اپنے ذاتی مذہبی جذبہ سے علیحدہ ہو کر محض تحقیقی نقطۂ نظر سے غور کرتے، اور پھر اسی معیار پر مصنف کے قائم کردہ نظریوں اور پیش کردہ نتائج کو جانچتے، مثلاً مصنف نے مکہ میں اسلام کی کامیابی، اور پھر عام عربوں میں قبولِ اسلام کا راز "نماز باجماعت" کو قرار دیا ہے، اور لکھتا ہے:۔

"نماز باجماعت ..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام ..... اس کا آغاز ان معزز لوگوں

میں ہوا جنھوں نے آج تک کسی اجنبی کے سامنے گردن نہیں جھکائی ..... اگر ہم اتنا خیال کریں تو یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریقِ عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت میں باقاعدہ اجتماع سے مسلمانوں کے اندر عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساواتِ انسانی کا احساس ہوا ...... اور اس سے خاندان اور قبائل کے تنگ تخیل پر ایک کاری ضرب پڑی،" (ص ۲۵)

آخر نماز باجماعت کا خاطر خواہ نتیجہ مصنف کے خیال کے مطابق یہ ہوا کہ:۔

"مکہ کی اس جدید جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام کا قدیم امتیاز بھی خطرے میں تھا،" (ص ۲۷)

اب دیکھئے مصنف نے یہ تمام قیاسات و نتائج صرف اس پر استنباط کئے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ میں نماز باجماعت قائم کی، اور اسی سے اسلام نے ترقی کا راستہ دیکھا، حالانکہ جب واقعیت کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز باجماعت کا حکم شریعت میں اس وقت ہوا، جب اسلام کو ایک لازوال استحکام حاصل ہو چکا تھا، یعنی آپ مکہ سے مدینہ تشریف لا چکے تھے، اور انصار کی ایک بڑی جماعت معاونت کے لئے کھڑی ہو چکی تھی، یہ صحیح ہے، کہ نماز باجماعت سے عبادت کے ماسوا انسان کی اخلاقی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور اس سے عصبیت کے دائرے کو توڑنے اور مساواتِ انسانی کا احساس پیدا کرنے کے اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں، لیکن نماز باجماعت کے یہ اثرات مدینہ کی زندگی کے واقعات ہیں نہ مکہ کی، کہ وہاں تو ایک آدمی کا بھی تنہا نماز پڑھنا مشکل تھا چہ جائیکہ ایک جماعت لیکن مصنف نے اس موقع پر تدلیس سے کام لیکر نماز باجماعت کو مدنی احکام میں شمار کرنے کے بجائے اس کو اسی قدر قدیم بتایا جس قدر کہ اسلام ہے، کیونکہ اسے آپ کو آپ کی مدنی زندگی میں ایک دوسری حیثیت سے پیش کرنا تھا، چنانچہ اس کے خیال کے مطابق آپ چاہتے تھے کہ مدینے کی ہر جماعت کو اپنا ہمدرد بنا لیں،" (ص ۳۱)

ان حالات میں مصنف سے سوال ہو سکتا ہے، کہ ایسی حالت میں، مدینہ میں آکر غلاموں کو آزاد کرانا،
قبائل کو اپنی عصبیت سے روکنا، کیا نعوذ باللہ آپ کے مدنی اصولِ سیاست کے برخلاف ثابت نہ ہوگا،
کیا آپ اپنے اس طرزِ عمل سے مدینہ کی تمام جماعت کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے، پھر نماز باجماعت کو مدینہ میں
قائم کرنا جس سے ایسے ہی نتائج نکلتے ہیں، کیا آپ کو ملتوی کر دینا نہ تھا، لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے
ہیں کہ مکہ میں جہاں مصنف کے خیال کے مطابق اس کی ضرورت تھی، آپ اس کو قائم کرنے کا موقع نہیں
پاتے، اور مدینہ میں جہاں مصنف کے نظریوں کے مطابق اس کو روکنے کی ضرورت تھی، آپ جاری فرماتے ہیں،

اسی طرح مصنف نے زکوٰۃ کے حکم کو بھی اوائلِ اسلام میں شمار کیا ہے، اور اس سے بھی اسی قسم کے
نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ زکوٰۃ کا باقاعدہ حکم عرب میں، اسلام کے غالب آجانے یعنی فتح مکہ کے بعد
سنہ ۹ھ میں نازل ہوا اور اس سے پہلے زکوٰۃ صرف ایک عام خیرات کی حیثیت سے اسلام میں اسی طرح سے تھی جس طرح دوسرے مذہبوں میں،

ان واقعات سے سمجھا جا سکتا ہے، کہ ایک واقعہ میں محض تھوڑی سی تدلیس کر کے مصنف نے کیسے
اہم نتائج استنباط کئے، حواشی میں ان امور پر روشنی ڈالنا تھا،

مصنف اسی طرح آگے چل کر لکھتا ہے، "اب آپ کی پیغمبرانہ حیثیت نظر سے چھپتی جاتی ہے اور
اس کے بجائے آپ مدبر کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں، اب نبوت کا کام صرف یہ ہے کہ ان کی
شانِ ریاست میں اضافہ کرے، اور آپ کی طاقت کے قیام و استحکام اور اس کی توسیع کے لئے ایک موثر
ذریعہ بن سکے (ص ۳۰) پھر مہاجرین و انصار کے عہدِ مواخاۃ کو ایک خاص سیاسی حکمت عملی بتانے کے بعد
آپ کی مدنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، پہلے آپ کا اپنے صحابہ میں سادگی و انکسار سے زندگی بسر کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے،
"البتہ وفات سے دو برس قبل آپ نے اپنے لئے ایک اونچی نشست تعمیر کرائی جس پر آپ اس وقت
بیٹھتے تھے جب آپ کو کسی ایلچی یا سفیر سے ملنا ہوتا تھا یا جب آپ جماعتی امور پر غور فرماتے یا مقدمات کا فیصلہ کرتے
تھے، یہ منبر ایک چبوترہ تھا ...... اس سادہ نشست سے رفتہ رفتہ ایک منبر کی بنا پڑی،" (ص ۳۱)

گو مصنف کے بیان کے مطابق آنحضرت صلعم نے پہلے سادہ زندگی بسر کی پھر جب مدینہ پر اقتدار حاصل ہوا اور عرب کے تمام حالات حسبِ دلخواہ ہو گئے تو منبر تیار ہوا، کا اظہار
مقصود ہوا اور صحابہ میں ترفع و تفوق کیلئے اور خاص خاص موقعوں کیلئے ایک ممتاز نشست گاہ بنوائی اور پھر عیسائیوں کے اثر سے اسکو منبر کی حیثیت دی
لیکن مصنف کا یہ بیان ہے دوسری طرف واقعات کی اصلیت دیکھئے جو متن ذیل ہے:-

عن ابی ذر و ابی هریرة قال کان رسول الله صلعم یجلس بین ظهری اصحابه فیجیئ الغریب فلا یدری ایهم هو حتی یسأل فطلبنا الی رسول الله صلعم ان نجعل له مجلسا یعرفه الغریب اذا اتاه قال فبنینا له دکانا من طین یجلس علیه وکنا نجلس بجنبیه	حضرت ابوذر اور ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے صحابہ کے بیچ میں تشریف رکھتے جب باہر کا کوئی آدمی آتا تو نہیں جانتا کہ آپ ان میں کون ہیں یہاں تک کہ وہ پوچھتا اس بنا پر ہم نے آپ سے درخواست کی کہ آپ کیلئے کوئی خاص ممتاز جگہ بنا دیں کہ باہر کے آدمی پہچان لیں تو ہم نے آپ کیلئے مٹی کا ایک چبوترہ بنایا تو آپ اس پر تشریف رکھتے اور ہم لوگ آپ کے پہلو میں بیٹھتے،

یہ ہے ایک نہایت سادہ واقعہ جو رنگ آمیزی سے کیا سے کیا ہو گیا، اس میں ترفع و بلندی کی جھلک نظر آتی ہے نہ اس کو خود آنحضرت صلعم سے
کوئی سروکار ہوتا ہے، محض چند صحابہ صرف اسلئے کہ آپ کے پہچاننے میں لوگوں کو دقت نہ ہو، ایک چبوترے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اور آنحضرت صلعم سے
درخواست کرنے کے بعد خود بنا دیتے ہیں، جس میں خود آنحضرت صلعم کے امر و خواہش کو قطعی دخل نہیں ہوتا ہے، اور نہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص خاص موقعوں ہی
پر اس پر تشریف فرما ہوتے تھے، بلکہ یہ عام نشستگاہ تھی جس کی تعمیر کے بعد آپ وقت و موقع کی تعیین کے بغیر برابر تشریف فرما ہوتے تھے،

مصنف نے منبر نبوی کو اسی چبوترے کی ترقی یافتہ شکل بتائی ہے، حالانکہ یہ بالکل اس سے ایک علیحدہ شے ہے، منبر نبوی کی تعمیر کی
غرض یہ تھی کہ آپ صحابہ کو نماز کے صحیح ارکان ادا کرنے کی تعلیم دیں، چنانچہ جب وہ مسجد میں آیا تو آپ نے اس پر کھڑے ہو کر نماز ادا کی،
لوگوں نے آپ کی اقتدا کی اور نماز کے بعد آپ نے فرمایا،

یا ایها الناس انما صنعت هذا لتاتموا و لتعلموا صلوٰتی	لوگو میں نے یہ اسلئے کیا تاکہ تم میری اقتدا کرو، اور میری نماز کو دیکھ لو،

اور اس کے بعد یہ منبر ہمیشہ خطبہ کے کام آیا، خطیب کو ایک بلند مقام کی ضرورت ہوتی ہے، یہ منبر موجود تھا، اس لیے
آپ ہمیشہ نماز کے بعد اسی پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، یہ نشستگاہ کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا گیا،

اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اس باب میں سطر سطر پر موجود ہیں، میرا یہاں یہ مقصود نہیں کہ

ابو داؤد ج ۲ ص ۱۶۲ کتاب السنہ، بخاری ج ۱ ص ۱۰۸ باب فی ایجاد المنبر،

میرا یہ مقصود نہیں کہ اس تبصرہ میں اس کے نقائص کو مکمل طور پر بیان کروں، ان اشارات سے صرف یہ مقصود ہے کہ نیازی صاحب نے جب کتاب کے مباحث کی ساری ذمہ داری لی، تو ان امور کو خاص طور پر دیکھنا تھا، نہ یہ کہ سوا ایک آدھ بات کے ساری کتاب ان کی دقتِ نظر، اصابتِ رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے"

تیسرے باب "فتوحاتِ اسلامی" میں خلافت راشدہ کے حالات بہ ترتیب سنین ہیں، سنین کے متعلق مصنف کا عجب طرزِ عمل ہے، کسی جگہ فتوحات کو سنہ ہجری کے حوالہ سے لکھا ہے اور کہیں سنہ عیسوی کے، ہجری سنین میں معلوم نہیں مصنف نے اپنا ماخذ کن کتابوں کو قرار دیا ہے، اکثر شہروں کا سنہ فتح اس کے معروف سنہ فتح سے مختلف ہے، مثلاً بیت المقدس کی فتح ۱۸ھ (ص ۵۴) میں بتائی گئی ہے، حالانکہ صحیح روایت رجب ۱۶ھ ہے، قادسیہ کی جنگ کو ۱۶ھ میں بتایا ہے (ص ۵۵) حالانکہ وہ محرم ۱۴ھ میں پیش آئی، اسی طرح رقہ کی فتح کو ۲۲ھ میں قرار دیا ہے، حالانکہ ۱۷ھ میں واقع ہوئی، ان سب سے بڑھ کر لطف جزیرہ قبرص کی فتح کا سنہ ہے (ص ۵۶) پر ہے، "۲۸ھ میں انھوں نے سمندر کی راہ سے قبرص پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا"، پھر آگے چل کر یہی سنہ ۲۸ھ سے ۳۳ھ ہو جاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے، "جنگی بیڑے سے مسلمانوں کی سرگرمی کی ایک اور مثال ملتی ہے ۳۳ھ ہی میں قبرص فتح ہو گیا" (ص ۵۹) اگر ہم ان دونوں بیانوں میں تطبیق دینے کے لئے اس کی توجیہ میں اس تاریخی حقیقت کی طرف رجوع بھی کریں کہ ۲۸ھ میں قبرص فتح ہوا اور اس نے جزیہ دینا منظور کر لیا، اور بعض معاہدے طے پائے لیکن چند سال کے بعد اہل قبرص نے بدعہدی کی اور امیر معاویہ نے ان پر دوبارہ فوج کشی کر کے اہل قبرص سے جنگ کی اور دوبارہ فتح کیا تو بھی یہ دوبارہ واقعہ ۳۳ھ میں پیش آنے سے ایک سال پہلے ۳۲ھ میں پیش آیا، کیا ہم مصنف کی ان تاریخی غلط بیانیوں کو صرف اس لئے تسلیم کر لیں کہ یہ ایک مستشرق کی شان تحقیق ہے، اور نیازی صاحب نے اسی باب میں جا بجا حواشی ثبت کئے ہیں، کیا ان حواشی میں ان غلطیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا؟

اسی طرح ص ۶۷ پر مصنف نے فتح بیت المقدس کے موقع پر ہیکل سلیمانی اور فتح دمشق کے وقت کلیسائے یوحنا کے متعلق جو بے سروپا روایت درج کی ہے، وہ بہت کچھ تاریخی شہادت کی طلبگار ہے، مصنف کا بیان ہے

"جب دمشق میں مسلمانوں نے کلیسائے یوحنا کی شاندار عمارت دیکھی تو انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اس عمارت میں ان کے ساتھ شریک ہو جائیں، اس طرح عیسائی اور مسلمان ایک ہی دروازے سے عبادت کے لئے داخل ہوتے تھے"، پھر لکھتا ہے "بیت المقدس میں انھوں نے ہیکل سلیمانی کی جس کا رسول اللہ صلعم نے اس ذوق و شوق سے ذکر کیا تھا (اور جہاں آپ شب معراج کو تشریف لے گئے تھے) تلاش شروع کی جب حضرت عمرؓ بیت المقدس پہونچے تو انھوں نے وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس جگہ جہاں ہیکل سلیمانی موجود تھی سوائے خاک کے ایک ڈھیر کے اور کچھ نہ تھا، لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلعم غلطی کریں، لہذا موجودہ کلیسائے مریم کے پاس ایک اور مقام آنحضرت صلعم کے سفر معراج کی جگہ قرار دیا گیا، اور اسے اسلام کے لئے مخصوص کر لیا گیا" (ص ۶۷)

کلیسائے یوحنا کے متعلق مصنف کا یہ بیان تاریخی شہادتوں کے قطعی برخلاف ہے، فتح دمشق کے موقع پر عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا اس کے رو سے عیسائیوں کے کلیساؤں سے کسی قسم کا تعارض نہ کرنے کا عہد خود آنحضرت صلعم کی اجازت سے ہو چکا تھا، اور مدت تک اسلامی حکومت اس کی پابند رہی، البتہ امیر معاویہ نے اس کو جامع مسجد میں لینا چاہا، لیکن ناکام رہے، یہاں تک کہ ولید نے اپنی ضد اور کسی قدر عیسائیوں کے بعض ناروا طرز کلام سے غضب آلود ہو کر اس کو منہدم کرا کر جامع دمشق میں شامل کر لیا، اور ہیکل سلیمانی کے متعلق مصنف کا یہ ادعا نہ صرف تاریخی شہادتوں کے برخلاف بلکہ بڑی حد تک مضحکہ خیز ہے، ہیکل سلیمانی ۱۰۱۳ ق م سے ۱۳۶ م تک مختلف قوموں اور مذہبوں کا معبد رہا ہے، بت پرست، یہود، نصاریٰ سب کے سب اس میں مساوی حیثیت سے حصہ لیتے رہے اور اس لئے ہر قوم اور ہر زمانہ میں وہ معلوم و مشہور رہا، اور اس کی مستند تاریخ ابتدائے قیام سے آج تک موجود ہے، ایسی حالت میں مصنف کا اس کے ہیکل سلیمانی ہونے سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ توجہ کی، حد درجہ حیرت انگیز ہے، ورنہ کم از کم اس موقع پر اس کو ہیکل سلیمانی کے جائے وقوع کی طرف تو اشارہ کرنا تھا،

اس کے علاوہ مصنف نے حضرت عمرؓ کے ساتھ خاص توجہ کی ہے، ان کے ملکی فتوحات اور طریق سیاست کو ایک عجب انداز میں پیش کیا ہے، کہتا ہے، "حضرت عمرؓ کے نزدیک کوئی غیر عرب عرب کے برابر نہیں ہو سکتا تھا"

چاہتے تھے کہ عربیت کو فروغ دیں، چنانچہ اس کے لئے انھوں نے عرب میں سوائے اسلام کے اور کسی مذہب کو
باقی نہیں رہنے دیا، اس کے ساتھ ان پر آنحضرت صلعم کے معاہدوں کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا ہے
(ص ۶۱) حالانکہ آنحضرت صلعم نے غیر قوموں سے جو معاہدے فرمائے تھے خود انھیں قوموں نے ان کی خلاف ورزی
کی اور بالآخر خود آنحضرت صلعم ہی نے بعض مصالح کی بنا پر مرض موت میں فیصلہ فرمایا، اخرجوا المشرکین من جزیرۃ
العرب (طبقات ابن سعد ج ۲ قسم ۲ ص ۳۶) اور دوسری روایت میں اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب
ہے، یعنی مشرکین، یہود، نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو، اس لئے حضرت عمرؓ کا جو طریق سیاست تھا، وہ آنحضرت صلعم
کے معاہدوں کے خلاف ہونے کے بجائے، فرمان نبوی ہی کی تعمیل تھی،

مصنف خلافت راشدہ کے حالات بیان کرتے ہوئے جب عہد عثمانی میں آتا ہے تو اس کو مکہ معظمہ
و مدینہ منورہ میں "عیش و عشرت کا چرچا نظر آتا ہے" اور اسی عہد میں "یہاں موسیقی کا بھی نہایت پرتپاک
خیر مقدم ہوتا ہے، یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے وسط ہی میں مکہ اور مدینہ عربی نغمہ و ساز کے گہوارہ بن گئے
امرا یونانی اور ایرانی مغنیوں کے لئے غیر معمولی روپیہ صرف کرتے تھے" (ص ۴۸) نیازی صاحب نے عربوں کے
فن موسیقی پر ایک طویل حاشیہ بھی لکھا ہے، لیکن انھیں مصنف کی اس غلط بیانی کی تردید کی ضرورت نہیں پڑی،
بیشک عربوں کو موسیقی سے گہری دلچسپی ہوئی، لیکن کس زمانہ میں؟ خلافت راشدہ کے عہد میں نہیں بلکہ …
ذوق شعری کی آخری منزل نغمہ و ساز میں ظاہر ہوئی، اور پھر اسی کے ساتھ اس کے ضروری لوازم بھی رواج پا…
ان مزخرفات کو خلافت راشدہ سے کیا تعلق؟ یہ اس لئے نہیں کہ وہ عام مسلمانوں میں اسلامی تعلیم کے عین …
نہایت مبارک عہد سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ تاریخی شہادتیں اسی کو ثابت کرتی ہیں، کہ خلافت راشدہ اور خود …
میں جو کچھ موسیقی تھی وہ اسی قدر تھی جو شاعری کی لازمہ ہوتی ہے، اس عہد کے چند مغنیوں کے نام ملتے ہیں، لیکن محض
ان چند ناموں کے وجود سے سارے مکہ مدینہ اور وہاں ایک عام دلچسپی پیدا ہونے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے،

چوتھے باب "بنوامیہ" اور پانچویں باب "بغداد" میں اموی و عباسی حکومتوں کے قیام و استحکام اور

زوال کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلامی تمدن کے مختلف شعبوں کی بنا اور پھر ترقی ہوئی، اسی لئے
مصنف نے انھیں ابواب میں کسی قدر تفصیل سے اسلامی تمدن کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے،

تاریخی واقعات میں مصنف نے خلافت کی سرگرمیوں کے لئے باشندگان مکہ و مدینہ کو ایک دوسرے کا حریف
قرار دیکر ایک عجیب حقیقت پیش کی ہے، مصنف کی اس تقسیم کے مطابق حضرت عثمانؓ سے انتقام لینے والا گروہ مدنی
تھا (ص ۱۱)، حضرت علیؓ خلافت کے مدنی امیدوار تھے (ص ۴۴) اور لطیفہ یہ ہے کہ حضرت زبیرؓ مکی امیدوار (ص ۴۲)
اور حضرت ابن زبیرؓ مدنی امیدوار تھے (ص ۴۳)، حالانکہ خلافت کے لئے اگر کبھی مکی اور مدنی ایک دوسرے کے مقابل
آئے تو وہ صرف آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد خلیفۂ اول کے انتخاب کے وقت مہاجرین و انصار کی حیثیت سے
سامنے آئے، ورنہ اس کے بعد خلافت کے لئے جتنی آویزش ہوئی وہ صرف قبائلی عصبیت کے ماتحت تھی، اگر مقابلہ
تھا، تو قریش اور غیر قریش کا، بنو ہاشم اور بنو امیہ کا اور یہی آخر الذکر مقابلہ آخر تک قائم رہا، اور بالآخر بنو امیہ کے
زوال اور دولت عباسیہ کے قیام کے بعد یہ مقابلہ بھی ختم ہوا اور پھر عباسی و علوی نبرد آزمائی ہوئی، لیکن مصنف نے
اس پورے باب میں اس عہد کی تمام تاریخ کو مکی و مدنی تفریق سے ملوث کیا ہے،

اور اسی طرح مصنف کا یہ بیان بھی تاریخی حیثیت سے عجیب حیرت انگیز ہے کہ "امویوں کے زمانہ حکومت کے
وسط ہی میں عباسیوں نے جو آنحضرت صلعم کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد تھے، راسخ الاعتقاد مسلمانوں
میں اس قدر عزت و اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ ان کی طرف سے امویوں کے دل میں خوف پیدا ہو گیا تھا" (ص ۸۷)
حالانکہ اس وقت بنو امیہ کے مقابلہ میں خلافت کا دعویدار جو گروہ تھا وہ علوی اور شیعیان علی کی جماعت تھی، اور
حضرت علیؓ ہی کے نام پر بنو امیہ کی حکومت کو زوال آیا، اور علوی حکومت قائم ہونا چاہتی تھی کہ بعض اتفاقی
واقعات کی بنا پر زمام حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی، کیا مصنف کی یہ تاریخ دانی لائق مترجم کے لئے
قابل توجہ نہ تھی،

مصنف نے اس باب میں اسلامی تمدن کے سلسلہ میں مختلف علوم کی بنا کا تذکرہ کیا ہے، مصنف نے

اس موقع پر علم کلام کے مختلف مذہب مثلاً معتزلہ کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ گویا ابتک عقائد میں صرف اختلافات پیدا ہوئے تھے، اور اس فن نے کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، یہاں تک کہ "امام اشعری (۳۲۴ھ) کی بدولت جو معتزلیت سے الگ ہو کر راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے تھے، علم کلام کی ابتدا ہوئی (ص ۱۰۹) گویا مصنف کے نزدیک علم کلام کی ابتدا اشاعرہ سے ہوتی ہے، حالانکہ یہ فن ان سے پہلے ہی علم کلام ہی کے نام سے مدون ہو چکا تھا، اور ابو ہذیل علاف متوفی ۲۳۵ھ کے عہد سے اشاعرہ کی ابتدا تک اس فن میں سینکڑوں کتابیں تالیف ہو چکی تھیں،

تدوینِ علم حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے ص ۱۰۹ پر ہے "امام بخاری اور امام مسلم کے مجموعے سب سے زیادہ قدیم ہیں، معلوم نہیں امام مالک کی موطا اس موقع پر کیوں نظر انداز کر دی گئی جو اس سے ایک صدی پیشتر تالیف پا چکی تھی نیز اور بھی کتابیں ہیں جو ان سے پہلے تالیف ہو چکی تھیں جنکی تعداد تقریباً پچاس کتابوں سے کم نہ ہوگی، "ابن ندیم نے ان سب کا تذکرہ ...

علم تاریخ کی ابتدا عبید بن شریہ سے کی گئی ہے، حالانکہ تحقیق کی منزل اس سے آگے پہنچ چکی ہے، عبید بن شریہ کی کتاب کا نام "اخبار الملوک" لکھا گیا ہے (ص ۱۱۰) اور انگریزی مترجم نے حاشیہ میں "اخبار الملوک والامم الماضیہ" بتایا ہے، حالانکہ اس کتاب کا صحیح نام "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" ہے، ابو مخنف لوط بن یحییٰ کی کتابوں کی تعداد ۳۲ بتائی گئی ہے (ص ۱۱۰)، باوجودیکہ عام طور پر ۳۲ مشہور ہیں اور سب کے نام بھی موجود ...

اسی طرح علم نحو اور مذاہب فقہ کی ابتدا کے متعلق مصنف سے تسامح ہوا ہے، مصنف نے مختلف مذاہب فقہ کے موجودہ مقلدین کا بھی تذکرہ کیا ہے" اور اس سلسلہ میں حنابلہ کے متعلق لکھتا ہے، "اب صرف اندرونی عرب میں زیادہ تر وہابیوں میں محدود ہے (ص ۱۱۲) حالانکہ خود یورپ کے مہیا کئے ہوئے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ آجکل عرب میں اہل نجد کے علاوہ قطر، بحرین، میں حنابلہ موجود ہیں اور احسا میں تو حنابلہ کو غلبہ حاصل ہے، اس کے علاوہ شام کی مجموعی اسلامی سنی آبادی میں سے نصف احناف اور نصف میں سے پہلے شافعی اور پھر حنابلہ ہیں، فلسطین میں شوافع کے بعد حنابلہ کو غلبہ حاصل ہے اور تعداد میں احناف اور مالکیوں سے بہت زیادہ ہیں، اسی طرح عراق بھی حنابلہ سے خالی نہیں ہے"

چھٹے یعنی آخری باب "شمالی افریقہ اور اندلس" میں عربوں کے حملوں، فتوحات اور استحکام حکومت کا تاریخی تذکرہ کر کے یہاں کی تمدنی ترقیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، یوں تو مصنف کو فنِ تعمیر سے جو دلچسپی ہے، وہ کتاب میں جا بجا نمایاں ہے لیکن اس باب میں خصوصیت سے اسی فن کو پیش کیا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ بحث بھی اپنی جگہ نہایت تشنہ ہے، ہماری نظر بار بار اس باب میں شمالی افریقہ کے ماتحت سرزمین صقلیہ (سسلی) کے اسلامی تمدن کا تذکرہ تلاش کرتی رہی، خصوصاً اس لیے کہ یہ باب جس خاص موضوع یعنی اسلامی فنِ تعمیر پر ہے، صقلیہ کو اسمیں خصوصیت سے دخل حاصل رہا ہے، لیکن مصنف نے اسمیں ناقابلِ فراموش فروگذاشت کی ہے،

اس کے علاوہ شمالی افریقہ کے اسلامی فنِ تعمیر کی تاریخ میں بھی مصنف سے متعدد مسامحات ہوئے ہیں مثلاً ایک موقع پر ہے، کہ شمالی افریقہ کے اسلامی فنِ تعمیر میں بارہویں صدی عیسوی میں بغدادی محرابوں کے بجائے پتوں کی سی نوکدار محرابیں وجود میں آئیں (ص ۱۴۹) یا وہاں داخلہ کے دروازوں کی زینت چودھویں صدی سے شروع ہوئی (۱۵۰) یا اسی طرح اسلامی طرزِ تعمیر میں خوبصورت بیلیں، پیتل سے پچی کاری وغیرہ شمالی افریقہ میں بارہویں سے چودھویں صدی تک داخل ہوئیں، حالانکہ پتوں کی سی نوکدار محرابیں، صدر دروازوں کی زینت، خوبصورت بیل بوٹے اور پیتل اور نقرئی و طلائی پچی کاری وغیرہ شمالی افریقہ، اور اس کے واسطے سے صقلیہ میں اس زمانہ سے بہت پہلے چوتھی سے چھٹی صدی ہجری میں اسلامی طرزِ تعمیر میں داخل ہو چکی تھیں جن کی باقیماندہ یادگاریں آج بھی مختلف ٹکڑوں کی شکل میں بلرم (پلرمو) کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں اور خود محققینِ یورپ نے بھی انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اسلامی فنِ تعمیر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اسی عہد میں یہاں پتوں کی سی نوکدار محرابوں کے رواج پانے کا تذکرہ کر چکے ہیں،

مصنف نے اندلس کی علمی ترقیوں کے ذیل میں یونانی حکیم دیسقوریدس کی کتاب کا تذکرہ کچھ عجب انداز میں کیا ہے، لکھتا ہے، "قیصر روم کو عبد الرحمٰن ثالث کے لیے اس کتاب سے کوئی بہتر تحفہ نہ مل سکا، چونکہ اس وقت اندلس میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو یونانی زبان جانتا ہو اس نے نکولس کو بھیجا گیا تاکہ وہ اس کا

ترجمہ عربی میں کردے۔" (صفحہ ۱۳۲) واقعات میں مبالغہ آمیزی تو مستشرقین کے بیان کے مطابق مشرقی مصنفین میں ہوتی ہے، لیکن ہمیں یہاں پر مصنف کے اس بیان میں اس کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے، دیسقوریدیس کی کتاب مسلمانوں کے لیے عبدالرحمٰن ناصر کے عہد میں کوئی نایاب کتاب نہ تھی، اگر اس کا ترجمہ خلیفہ عباسی جعفر متوکل کے عہد میں اصطفن نے یونانی سے عربی میں کرکے اسکو شائع کردیا تھا، لیکن ان چند بوٹیوں کے نام ترجمہ سے رہ گئے تھے حسن اتفاق ارمانیوس قیصر روم نے چند دیگر تحائف کے ساتھ کتاب دیسقوریدس بھی بھیجی جس کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ تصویروں سے مزین تھی اور چونکہ اسی عہد میں اندلس میں اطبا کی ایک مجلس طبی تحقیقات میں مصروف تھی اس لیے یہ کتاب ان کے سامنے پیش کیگئی کہ اصطفن سے جو کچھ خامیاں رہ گئی ہیں وہ پوری کردیجائیں، لیکن یہ کتاب بھی یونانی زبان میں تھی، اس لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو اس زبان پر پورا عبور رکھتا ہو اور اسی لیے (نکولس) قسطنطنیہ سے طلب کیا گیا، اس نے یونانی سے لاطینی میں ترجمہ کیا، اور عرب اطبا نے لاطینی سے عربی میں (طبقات الاطباء ج ۲ صفحہ ۴۸ مصنف کے بقول نکولس ہی نے یونانی سے عربی میں منتقل کیا،

اب ہمیں چند باتیں مترجم کے حواشی کے متعلق کہنا ہیں، پروفیسر صلاح الدین خدابخش کے حواشی نہایت مفید اور معلومات سے لبریز ہیں، اور جہاں جہاں انھوں نے مصنف کے خیالات سے اختلاف کیا ہے اس کو معقول طریقہ سے پیش کیا ہے، مصنف کے مبہم بیانات کی تحقیق بھی قابلِ ستایش ہے، لیکن اس سلسلہ میں چند حواشی غور طلب ہیں، نیازی صاحب نے پروفیسر موصوف کے بعض حواشی کی بھی تصحیح یا توضیح کی ہے، اس لیے پھر انھیں ان تمام حواشی کی بھی مزید تحقیق کرنا تھی، مثلاً صرف صفحہ ۱۳۱ کے چند حواشی ملاحظہ ہوں،

حاشیہ صفحہ ۱۳۱ میں ابو علی اسمعیل صاحب امالی کا سنہ ولادت ۲۸۰ھ بتایا گیا ہے، جو اگرچہ بعض روایتوں میں دیا ہے، لیکن اس کے سنہ ولادت کا صحیح سنہ جسکو اہل علم مستند سمجھتے ہیں وہی ہے جو ابن خلکان اور بغیۃ الوعاۃ وغیرہ میں منقول ہے، وہ ۲۸۸ھ ہے، اور اسی کو امالی کے سرورق پر بھی درج کیا گیا ہے،

اسی صفحہ میں اندلس کے چند مشاہیر کا تذکرہ ہے، اسی سلسلہ میں ہے، "الرضی (مطابق اصل) الرازی

ابن القوطیہ تاریخ کے بہترین علماء میں ہیں" اس موقع پر مترجم نے حاشیہ میں ایسے چند نام پیش کردیئے ہیں، جن کے ساتھ "الرضی" یا "الرازی" ہے، اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑا ہے، حالانکہ یہاں پر متعین طور پر یہ دیکھنا تھا کہ حسب ترجمہ ابن القوطیہ کے متعلق ارباب تراجم لکھتے ہیں کہ وہ "اسکا سینہ اخبار و تاریخ کا گنجینہ تھا"، اسی طرح الرضی یا الرازی میں سے کس کو فن تاریخ سے زیادہ لگاؤ ہے، چنانچہ وہ محمد بن موسیٰ الرازی ہے جس کو ارباب تاریخ "صاحب التاریخ" کا لقب دیتے ہیں، اور یہی الرازی کے نام سے شہرت بھی رکھتا ہے[1]، اس لئے ترجمہ میں "الرضی" کے بجائے "الرازی" ہونا چاہیے،

اسی طرح اسی صفحہ پر ہے "فلکیات کا سب سے بڑا عالم غافقی تھا"، مترجم نے حاشیہ میں الیسع بن عیسیٰ کا نام پیش کیا ہے، لیکن سوالیہ نشان (؟) بھی لگادیا ہے، نیازی صاحب تحقیق کرتے تو معلوم ہوتا کہ الیسع بن عیسیٰ کو ان علوم سے کوئی مناسبت نہ تھی، یہ عالم دینیات تھے، یہاں غافقی سے مراد ابو جعفر احمد بن محمد الغافقی ہے[2]، یہی ماہر فلکیات تھا،

اسی صفحہ میں مصنف نے ابن جلجل کا نام لیا ہے، مترجم نے حاشیہ میں اس کا نام سلیمان بن جلجل بتایا ہے حالانکہ اس کا نام سلیمان بن حسان اور لقب ابن جلجل تھا[3]،

اتفاق سے نیازی صاحب نے اپنے ضمیمہ میں اسی صفحہ کے ایک حاشیہ کی تکمیل کی ہے، مصنف نے ایک ماہر علوم فطرت، سائنس کا نام لیا ہے، جو انگریزی ترجمہ میں "مجھارتی" ہوگیا ہے، انگریزی مترجم اس کی شخصیت سے واقف نہ ہوسکا، نیازی صاحب نے یہ عقدہ حل کرنا چاہا، اور مسلم بن محمد ابو القاسم مجرطی بتایا، معلوم نہیں نیازی صاحب نے مجریطی کا یہ نام کہاں سے اختیار کیا ہے، اس کا صحیح نام ابو القاسم مسلمہ بن احمد مجریطی ہے، ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے،

ان امام الریاضیین بالاندلس فی وقتہ[4] یہ اپنے وقت میں اندلس کے ماہرین ریاضیات کا امام تھا،

[1] تکملہ لابن آبار صفحہ ۲۶۶ [2] طبقات الاطباء ج ۲ صفحہ ۵۲ [3] ایضاً ج ۲ صفحہ ۴۹ [4] ایضاً ج ۲ ص ۳۹،

نیازی صاحب کا ضمیمہ زیادہ تر مستشرقین اور یورپ کے اہل قلم ہی کے اقتباسات کا رہینِ منت ہے، اور اسکی وجہ سے ضمیمہ کے لب ولہجہ اور طریقِ ادا میں بھی " مستشرقانہ انداز " پیدا ہو گیا ہے، ہمارے خیال میں اگر نیازی صاحب ذاتی تحقیق وکاوش سے کام لیتے تو ان کے ضمیمہ میں بہت سے ایسے فقرے نظر نہ آتے جو اس وقت کی طرف منسوب ہو کر شائع ہوئے ہیں، مثلاً فقہائے اندلس اور الحکم کی آویزش کا جو مشہور واقعہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے یہ فقرے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں، " فقہا کی بغاوت تاریخِ اسلام کا ایک عجیب واقعہ ہے، خوش قسمتی سے اس خودسر جماعت کے غیر متوازن مذہبی جوش اور خود غرضانہ تعصب وتنگدلی سے "... (ص۱۱۱)

یہ بتانے کے بعد کہ اس عہد میں فقہا میں سے اکثر ایسے تھے جو خود امام مالک کے شاگرد رہ چکے تھے، پھر لکھتے ہیں " ان نام نہاد فقہا کی اخلاقی حالت اس قدر پست ہو گئی تھی کہ ان میں سے طالوت نامی ایک فقیہہ " پھر اسی کے متعلق ہے " اس سنگدل فقیہ نے " پھر ہے " بجائے اس کے کہ یہ مغرور ومتکبر فقیہ .... نہایت بے شرمی سے کہنے لگا " پھر ہے " یہ ذہنیت تھی " اس فریب خوردہ جماعت کی جو ایک عشرت پسند مگر نیکدل سلطان کی معمولی کمزوریوں کو (معمولی کمزوریاں انھیں کے الفاظ میں یہ ہیں کہ زہد وعبادت کو پسند نہیں کرتا تھا، شراب کے استعمال کو جائز سمجھتا تھا) نظر انداز نہیں کر سکی اور اپنی جہالت اور تعصب کی بدولت " اب طریقِ ادا کی اسی میں سے ایک مثال لیجئے فرماتے ہیں " ایک روز جب قرطبہ کا ہر فقیہ کمالِ صبر واستقلال سے ماہِ صیام کی سختیاں برداشت کر رہا تھا، اور اس امر پر متاسف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، کہ ان کے آرام طلب امیر کے دل میں ان کے اس عظیم الشان ایثار وقربانی کی کوئی قدر نہیں ہے "

ضمیمہ کے ان حواشی میں شاید ایک حاشیہ ایسا ہے جو ذاتی تحقیق کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نیازی صاحب نے اس میں اپنی تحقیق کا کوئی بہتر ثبوت پیش نہیں کیا ہے، وہ ایک موقع پر مصنف کے اس خیال کی کہ تصوفِ اسلام افلاطونیت، بدھ مت اور آریائی اثرات کا شرمندۂ احسان ہے تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " لیکن کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بیرونی کے زمانہ سے قبل ہندوستان اور عالم

اسلامی کے درمیان کوئی علمی تعلق قائم تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب صوفیانہ خیالات اپنا انتہائی نشو ونما حاصل کر چکے تھے (ص۲۵۳) بیرونی سے قبل ہندوستان اور عالم اسلامی سے علمی تعلقات کا انکار کر کے اسلامی تصوف کو ان اثرات سے بچانے کی ناکام کوشش ہے، کیونکہ تاریخی طور پر ہندوستان اور عالم اسلامی میں علمی تعلقات بیرونی سے بہت پہلے قائم ہونا نہایت مستند طور پر معلوم ہے، اور یہ عام طور پر معلوم ہے کہ منصور خلیفہ عباسی کے عہد سے سنسکرت کتابوں کے ترجمہ کا کام جاری ہو چکا تھا، اور اسوقت سے ہارون پھر مامون کے عہدِ حکومت خصوصاً برامکہ کے دورِ اقتدار میں بہت سے اہل علم ہندوستان کے اور ہندوستان کے اطبا، فلاسفہ اور پنڈت بغداد بلائے گئے نیز از خود پہنچے اور اس وقت تک بہت سی کتابیں جنمیں خاص طور پر طب، فلسفہ اور مذہب کے موضوع پر تھیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، چنانچہ آپ کو اس عہد کے ہندوستان کے بہت سے ایسے اہل علم کے نام ابن ابی اصیبعہ، مسعودی، ابن ندیم، اور جاحظ کی کتابوں میں ملیں گے جنھوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے نیازی صاحب کو مصنف کے خیالات کی تردید کسی اور طریق پر کرنا تھا، اسی طرح اسی حاشیہ میں مصنف کے اس خیال کی تردید بھی صحیح طریق پر نہیں کی گئی ہے کہ " تصوف محض عربوں کی پیداوار اس لیے ہے کہ ابن عربی اور ابن فارض جیسے خالص عرب بھی اس میں شریک ہیں " کیونکہ یہ دونوں شخصیتیں تو اس وقت پیدا ہوئیں جب تصوف کی نشو ونما کامل طور پر ہو چکی تھی،

بہرحال اب نفس مضامین وحواشی سے گذر کر اس موقع پر اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی کہ جہاں تک ترجمہ کی زبان کا تعلق ہے، نہایت صاف، سلیس، رواں اور حد درجہ لائق ستایش ہے صرف ایک آدھ مقام پر مثلاً " اچھی بازار " (ص۱۳۵) " دن بدن " (ص۹۹) وغیرہ میں قلم کی لغزش نظر آتی ہے، ترجمہ کی ایک نہایت نمایاں خاص خصوصیت یہ ہے کہ انگریزی سے عربی شہروں اور ناموں کو نہایت صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے، جسمیں آجکل کے اہل قلم سے بالعموم غلطی ہو جاتی ہے " اگرچہ نیازی صاحب سے اس میں بھی ایک دو مقام پر فروگذاشت ہو گئی ہے، مثلاً افریقہ کے مشہور فاتح حسان بن نعمان کو ہر جگہ " حسن بن نعمان " لکھا یا ابو مخنف کو " ابو مخناف "

اسی طرح ص ۱۳۳ میں اندلس کے چند شہروں کا املا صحیح نہیں، مثلاً "ملاغہ" تلفظ کیا ہے Malaga سے اس کو یا تو صحیح انگریزی تلفظ میں ادا کیا جاتا تو ملاگا ہوتا، ورنہ پھر اس کا عربی تلفظ لیتے تو مالقہ ہوتا کہ اسلامی حکومت کے دور میں اس کا یہی نام تھا، اسی طرح "ساراغوسہ" تلفظ ہے Saragossa کا یہ بھی یا تو "ساراگوسا" ہوتا ورنہ یہاں عربی حکومت کے تذکرہ کی مناسبت سے اس کا عربی نام "سرقسطہ" لکھتے، اسی طرح اسی سطر میں اور بھی چند نام ہیں،

لیکن کتاب کے ترجمہ کے مجموعی محاسن کے سامنے یہ معمولی فروگذاشت یقیناً نظر انداز کرنے کے قابل ہے اور اس لیے ہم آخر میں نیازی صاحب کو ان کے اس کامیاب ترجمہ پر تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں،

المامون

یعنی خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہدِ سلطنت کے حالات مولانا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہے جسمیں ممدوح نے تاریخ اسلام کے پرفخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالات قلمبند کئے ہیں جن سے دولت عباسیہ کے عروج و کمال کے زمانہ کا مرقع آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہی، اتبک اسکے بازاری نسخے عام طریقے سے فروخت ہوتے تھے اب مطبع معارف نے خاص اہتمام سے طبع کراکے شائع کیا ہے،

کاغذ اور لکھائی چھپائی بہترین ہے،

ضخامت:- ۲۴۴ صفحے

قیمت:- عہ/ روپیہ

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

لسان و مطالعہ لسان، مترجمہ جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب یوسف زئی ص ۲+۳۴۰+۲۰ وح قیمت للعہ/ پتہ گورنمنٹ کالج، اجمیر،

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بانی سر ولیم جونس نے آج سے تقریباً ۱۵۰ سال قبل لسانیات کے ذریعہ انسانی تمدن و تہذیب برادری و تاریخ کے مطالعہ کی جس عمارت کی بنیاد رکھی تھی وہ روز بروز مکمل ہوتی جاتی ہے۔ آرین زبانوں کے مطالعہ نے اس کی رفتار میں تیزی پیدا کردی اور اب یہ فن الفاظ کی تاریخ سے گذر کر ایک وسیع علم ہوگیا ہے اور اسمیں متعدد دوسرے علوم شامل ہوگئے ہیں، گذشتہ صدی کے ثلث اول ہی سے انگلستان نے اسکی طرف توجہ کی اور اس وقت سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے، سنسکرت، پہلوی اور فارسی کے لسانی مطالعہ اور حکومت کی طرف سے ملک کی لسانی پیمایش نے ہندوستان میں بھی یہ ذوق پیدا کردیا۔ چنانچہ مولانا آزاد مرحوم سے لیکر اس وقت تک متعدد اشخاص نے عربی فارسی اُردو کے متعلق لسانی حیثیت سے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن ان چیزوں کی بنیاد اس فن کے خاص اصولوں پر نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی۔ اس کمی کو محسوس کرکے جناب پروفیسر صاحب موصوف نے انگلستان کے گذشتہ صدی کے مشہور استاد لسانیات پروفیسر ڈبلو۔ ڈی۔ وہٹنے (W. D. Whitney) کے لکچروں کے مجموعہ کو جو لسان و مطالعہ لسان ہیں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۷ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ حصہ اول ہے اور اسمیں ۶ لکچر ہیں۔ اسکے نو سال بعد ۱۸۷۵ء میں انھوں نے دوسری کتاب زبان کی زندگی و ترقی (Life & growth of Languag

شایع کی، پروفیسر صاحب کا مقصد اس ترجمہ سے اُردو داں اصحاب کو اس فن کے اصول سے واقف کردینا ہے، ترجمہ بہت صاف واضح اور بامحاورہ ہے البتہ بعض جگہہ بالکل لفظی کردیا گیا ہے مثلاً (Habits & mannerisms) کا ترجمہ "خصائل اور الجھنوں" زیادہ بہتر نہیں خصائل و عادات یا امتیازات بہتر ہوتا، بہرحال پروفیسر صاحب کو ہم انکی اس خالص خشک علمی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ علم دوست اصحاب اس سے ضرور مستفید ہونگے، مصنف کا پورا نام ولیم ۔ ڈوٹ ۔ وہٹنے ہے نہ کہ ہٹنے یہ وہی فاضل ہے جس نے انسائیکلو پیڈیا میں لسانیات کے موضوع کا تقریباً نصف حصہ لکھا ہے۔

ارنسٹ ترجمہ از جناب سید تمکین کاظمی صاحب و جناب عبدالمنعم صاحب سعیدی حجم ۱۱۰ قیمت عہ، پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن

غریب بدقسمت آسکر وائلڈ کی ۴۵ سالہ پُرطوفان زندگی میں ۱۸۹۵ء اپنی نحوست کیلئے تاریک ترین سال تھا اگرچہ اسی سال اسکے دو شہ کار آئیڈیل ہزبنڈ (the Ideal Husband) اور زیر تنقید تمثیل دی امپارٹنس آف بی اینگ ارنسٹ (the Importance of being earnest) شایع ہوئے لیکن اسی سال مارکوئس آف کوئنسبری کے مقدمہ کے سلسلہ میں اسے دو سال کی سزا بھی ہوگئی۔ ابتدا ہی سے وہ جمالیات کا پرستار تھا اور اسی جمال پرستی نے اسے اتنا بلند کردیا تھا کہ ایک نقاد کے خیال میں وہ اپنے عہد کا بہترین تمثیل نگار تھا، ہر چیز میں اسکی جدت ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے، موجودہ پُرشورش ادبی دور میں اُردو خواں اصحاب بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں چنانچہ اس کے متعدد مضمون اور افسانے مختلف رسائل میں شایع ہوچکے ہیں اور اب دو ادب دوست نوجوانوں نے اسکے ایک ڈرامہ کا ترجمہ شایع کیا ہے، ابتدا میں جناب سلطان حیدر صاحب جوش، جوش ملیح آبادی، مسعود حسن صاحب ذوقی، اور انیس مجتبیٰ صاحب صہبا کے علی الترتیب پیش لفظ، تاثر، تعارف اور اعلام ہیں اسکے بعد مترجمین کی تصویر اور انکی طرف سے تقدیم اور اسکے بعد تقریب تصحیح اور اصل ترجمہ ہے۔ ترجمہ کو اس سے زیادہ شگفتہ ہونا چاہیے تھا امید کہ طبع ثانی کے وقت طباعت کی موجودہ خرابیاں باقی نہ رہینگی

معین الآثار (حصہ اول تاریخ آگرہ) مولفہ جناب معین الدین احمد صاحب اکبرآبادی حجم ۱۸۶ مصور قیمت عہ، پتہ کچہری گھاٹ آگرہ،

آج سے تقریباً ربع صدی قبل ۱۹۰۴ء میں جناب مصنف نے جو ایک مشہور اہل قلم ہیں اکبرآباد کی مفصل تاریخ لکھنی شروع کی تھی اور اس سلسلہ میں اسکا پہلا حصہ جو تاج کی مفصل تاریخ تعمیری حالات اور اثری و فنی دلچسپیوں پر مشتمل تھا شایع بھی کیا تھا اسکے بعد بیرونی سیاحوں کیلئے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔ انگریزی میں اس قسم کی پہلی کوشش نواب سید محمد لطیف مرحوم نے کی تھی اور انکی کتاب مستند سمجھی جاتی ہے اب تک مصنف نے اسی پہلے حصہ کو کچھ اضافہ کیساتھ دوبارہ شایع کیا ہے کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور پر از معلومات ہے اورنگ زیب، شاہجہاں، جہان آرا وغیرہ میں تاج کے متعلق جو خط و کتابت ہوئی ہے اگر اس مجموعہ میں شامل کردیا جاتا تو وہ بہت مفید ہوتا، مرزا ساقی کی کتاب کا نام عالمگیر نامہ نہیں ہے بلکہ مآثر عالمگیری ہے،

حیات جلیل (دو حصہ) از جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی حجم ۲۰۰+۴۴۲ مجلد قیمت ے، پتہ رام نرائن لال تاجر کتب الہ آباد۔

علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی بارہویں صدی کے منتصف اول کے نہ صرف بلگرام، نہ صرف اودھ، نہ صرف پورب بلکہ تمام ہندوستان کے سب سے بڑے ہمہ دان ہمہ گیر صاحب فضل و کمال تھے۔ انکی تصانیف انکے تعلقات انکی سیاحت اور انکی تمام تر زندگی انکی سیاست انکی فضیلت اور انکے تبحر علمی پر دال ہے، ایسی متعدد ہستی کی ایک مستند و مفصل تذکرہ کی ضرورت تھی یوں تو مختلف کتابوں میں انکے حالات ملتے ہیں لیکن منتشر قطرے، رہرو منزل تحقیق کی پیاس کو بجھانے کیلئے کافی نہ تھے، ہم خوش ہیں کہ ایک ایسے شخص نے جو فرض کی انجام دہی کیلئے سب سے زیادہ موزوں تھا اسکو باحسن وجوہ انجام دیکر ایک بڑی ضرورت اور دیرینہ کمی کی تلافی و تکمیل کی ہے۔

مولوی مقبول احمد صاحب سے معارف کے ناظرین اچھی طرح واقف ہیں "اوراق پارینہ" کے زیر عنوان انکے مضامین معارف میں شایع ہوتے رہے ہیں، مسٹر ولیم آرون کی توجہ اور خود انکے والد ماجد کے فیض نے ابتدا ہی سے تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کردیا تھا اور موجودہ تصنیف اس کا بہترین ثبوت ہے۔

تذکرہ جلیل صرف ایک جلیل القدر بزرگ کے حالات ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسکو ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی عیسوی کی ہندوستان کی

کی علمی وسیاسی تاریخ کی انسایکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں حواشی کی افادی قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہمکو اگر فرصت ملی تو ہم اس کتاب پر کبھی مفصل تنقید شایع کریگے اس کتاب کیلئے ہم لائق مصنف کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں آپ کی یہ کوشش بار بار مقبول ہے

العروض والقوافی از جناب حافظ جلال الدین احمد صاحب جعفری ظ۔ قیمت ۱۲؍ پتہ انوار احمدی پریس الہ آباد،

کالجوں اور مشرقی علوم کے مختلف امتحانات میں فن عروض بھی نصاب میں داخل ہے اب تک جدید طرز پر فارسی عروض کے متعلق اردو میں کوئی ایسا رسالہ نہ تھا جو امتحان کے کام آسکے جناب حافظ صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کرکے لڑکوں کی تیاری کیلئے یہ رسالہ لکھا ہے جو اگرچہ جامع ہے لیکن بہت مختصر اور جبتک طلبہ مفصل اصول سے واقف نہ ہوں انکی بہر دی مشکل البتہ درجوں میں تقریرین لینے کے بعد یہ رسالہ بہت مفید ہوسکتا ہے اور اس قابل ہے کہ طلبہ اس سے استفادہ کریں' بعض جگہ طباعت کی غلطی نے معنی بالکل الٹ دیئے ہیں۔ مثلاً فاصلہ کبریٰ کی تعریف۔

ویزڈم آف دی پرافٹس (wisdom of the Prafhets) از جناب خانصاحب خواجہ خان صاحب بی۔ اے۔ ضخامت ۲۰۲ مجلد قیمت عہ پتہ ۶۹ جان جہان خاں روڈ۔ رائے پیٹھ۔ مدراس۔

جناب خانصاحب موصوف کو علمی تصوف سے جو خاص شغف ہے' اس کا ثبوت انکی کتابوں سے جو اس موضوع کے مختلف شعبوں پر شایع ہوئی ہیں ملتا ہے اب انھوں نے محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کا خلاصہ انگریزی میں شایع کیا ہے' ابتدا میں فرانسیسی مستشرق سینان کا مقدمہ ہے پھر محی الدین عربی کے حالات ہیں اور آخر میں الفاظ کی فرہنگ جو انگریزی دان براہ راست عربی سے استفادہ نہیں کرسکتے ان کیلئے ابن عربی کے خیالات جاننے کیلئے یہ بہترین ذریعہ ہے۔

مکتبہ (ماہوار رسالہ) مدیر جناب محمد عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل۔ بی ضخامت ۹۶ قیمت سالانہ للعہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمی حیدر آباد دکن۔

اسوقت حیدرآباد کی ریاست اردو رسائل کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے خاص امتیاز کی مالک ہے' زیر تنقید رسالہ تقریباً ایکسال سے شایع ہو رہا ہے' اسکے مضامین نے اسکو وہان کے رسائل مین خاص درجہ دے رکھا ہے بالخصوص مکتبہ ابراہیمیہ جس خاموشی سے وسیع علمی خدمات انجام دے رہا ہے اسی میں اس رسالہ کی اشاعت بھی قابل ذکر ہے،

"ن"

مجلد بست وسوم ۲۳	ماہ ذیحجہ سنہ ۱۳۴۷ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۲۹ء	عدد ۶

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۴۰۲-۴۰۴
ہندوستان عالمگیر کے عہد کی دو عجیب ہندو کتابین	"	۴۰۵-۴۰۸
غزالی یا غزّالی؟	جناب قاضی احمد میان صاحب جونا گڑھی مترجم طبقات الامم	۴۰۹-۴۱۷
انڈیا آفس لنڈن کی بعض دکھنی قلمی کتابین،	جناب محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی ایم اے (عثمانیہ)	۴۱۸-۴۳۰
کینٹ کے سوانح اور اسکے فلسفہ کی اہمیت	جناب پروفیسر محمد یوسف صاحب سلیم مرے کالج۔ سیالکوٹ	۴۳۱-۴۴۱
سلسلہ عالیہ مجددیہ اور علم حدیث	مولانا محمد فاروق صاحب بہرایچی مدرس اول جامع العلوم کانپور	۴۴۲-۴۵۰
شاہنامہ کے دو شعر	پروفیسر شیخ عبد القادر ایم۔ اے۔ دکن کالج پونہ	۴۵۱-۴۵۶
سنہ ۱۹۲۸ء میں سائنس کی علمی ترقیاں	"ر"	۴۵۷-۴۶۲
اخبار علمیہ	"ن"	۴۶۳-۴۶۶
ہم آہنگی تخیل	جناب خواجہ منظور حسین صاحب بلوچی	۴۶۷-۴۶۹
قطعہ تاریخ وفات	مولانا عبد الوسیع صاحب صفا پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	۴۶۹--
غزل	مولانا عبد السّلام صاحب ندوی	۴۷۰--
زین الاخبار	"س"	۴۷۱-۴۷۴
حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم حل،	"	۴۷۵-۴۷۶
مطبوعات جدیدہ	"ن"	۴۷۷-۴۸۰